تشنه عشق

واحبه فاطمه

"یہ تم نے کیا ناں؟ خود کو سمجھتی کیا ہو؟ ذرا طاقت کے نشے کی مدہوشی سے باہر نکلو تو تمھیں اپنی دو ٹکے کی اوقات کا پتہ چلے، بلکہ نہیں وہ تو میں یعنی رانا میر ہادی ہی تمھیں بتا دیتا ہوں کہ لویزا اقبال میری نظر میں تم ایک دو ٹکے کی آوارہ، بد کردار اور بدذات لڑکی ہو، میری شادی تڑوا کر کیا سمجھتی ہو؟ میں تمھارا ہو جاؤں گا؟ بھول ہے یہ تمھاری میں لعنت بھیجتا ہوں

تم پر، تم پر ایک نظر ڈالنا گوارا نا کروں، نہیں کرنی تم سے شادی اب جاؤ جو بن پڑتا ہے تم سے وہ کر لو، یا اپنے اس طاقت ور باپ سے کہو تمھیں کوئی کاٹھ کا الو خرید دے کیونکہ میں تو تم پر تھوکنا پسند نہیں کروں گا۔"

الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھے جو کانوں سے ہو کر اب آنکھوں سے لاوے کی صورت گلابی گالوں پر بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے باپ کی لاڈلی جو محبت میں بری طرح دھتکاری گئی تھی کسی بھی نتیجے کی پرواہ کیے بغیر بے

تحاشا تیز اور ریش ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ وہ اس کی نسوانیت ،پندار اور عزت نفس کو اپنے پیروں تلے بری طرح کچل کر وہاں سے نکلا تو کچھ ہی دیر بعد گاڑی لیے وہ بھی اس کے پیچھے ہی نکلی تھی کسی بھی انجام کی پرواہ کیے بغیر۔ مرنے یا مارنے کا عزم لیے؟

سب کچھ قبول تھا ہر غلیظ الزام سر آنکھوں پر لیکن بدکردار اور آوارہ؟

رانا میر ہادی نے کون سے وقت کونسی صدی میں اس کی آوارگی یا بدکرداری دیکھی تھی جو اس پر اتنا بڑا الزام

لگایا تھا۔ کیوں آخر کیوں؟ صرف اس شخص سے منسوب اپنے خالص جذبوں کی وجہ سے۔ جنھیں اس نے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔

نہیں ۔ آج لویزا اقبال کا جنون اس کی دیوانگی سب کچھ تہس نہس کر کے برباد کر دے گی۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بار بار آنسوؤں کی دھند آنکھوں کے سامنے آتی حد نگاہ پوری طرح ختم کر دیتی۔ وہ دوسرے رستے سے ہوتی رانا میر ہادی کی گاڑی کے عین سامنے والی سڑک سے آتی نظر آئی تو میر ہادی ٹھٹھک گیا۔

تھم گیا رک گیا۔ اس لڑکی کا اس کے لیے جنون، اس کی دیوانگی اب کیا رنگ دکھانے والی تھی اسے لمحوں کے ہزارویں حصے میں سمجھ آ گیا۔ لیکن بہت دیر ہو گئی۔ رانا میر ہادی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب وہ اپنی نوے کی رفتار سے چلتی گاڑی پر قابو نا پا سکا۔ لویزا نے ایک سو بیس کی رفتار سے اپنی گاڑی سامنے سے لا کر رانا میر ہادی کی گاڑی سے ایک دھماکے سے ٹکرائی تھی۔ میر ہادی نے تیزی سے سٹئیرنگ گھمانے کے باجود لویزا کی گاڑی کا بونٹ دائیں جانب سے میر

ہادی کی کار کے دائیں دروازے سے دھماکے سے ٹکرایا۔

لویزا کی گاڑی کا بونٹ بری طرح پچک گیا تھا۔ لویزا کو بے تحاشا چوٹیں آئیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو گئی۔ لیکن رانا میر ہادی کی ڈرائیونگ سیٹ خون سے تر بتر ہو گئی تھی۔ جگہ قدرے سنسان تھی۔ لیکن کچھ ہی دیر میں بہت سارے نامعلوم سیاہ نقاب پوش وہاں آئے۔ اور دیکھتے ہ دیکھتے زخمیوں اور گاڑیوں سمیت وہاں سے سڑک یوں صاف کر دی جیسے وہاں کچھ دیر

قبل کسی گاڑی کا نام و نشان تک نا تھا۔ سڑک یوں ہی سنسان تھی۔ وہاں اب کسی ذی روح کا نام و نشان تک نا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے---

لائبریری میں پن ڈراپ سائلنس چھائی ہوئی تھی۔ ڈارک براؤن شلوار قمیض میں ہالف وائٹ مردانہ شال کندھوں پر ڈالے رانا میر ہادی اپنی بھاری گھمبیر اور

پراسرار سی آواز میں دھیما پن اور نرمی سموئے اپنے سے دو سال جونئیر سٹوڈنٹس کو ان کے پروجیکٹ کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ دراز قامت، براؤن آنکھوں پر سیاہ سن گلاسز لگائے سرخ و سفید رنگت میں وہ بلا کا ہینڈسم اور ڈیشنگ لگا رہا تھا۔ اس کی پرسنالٹی ہی اتنی رعب و دبدبے والی تھی کہ یونیورسٹی میں کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جو ایک مرتبہ پلٹ کر اسے نا دیکھتی۔ وہ بے تحاشا گرومڈ شائنگ پرسنلٹی رکھتا تھا۔

منڈی بہاوالدین کی دیہی سرزمین اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے رانا میر ہادی میں وڈیروں جیسی کوئی بات بھی نہیں تھی وہ عادتاً اور فطرتاً بہت پولائٹ مہرباں اور سنجیدہ سی شخصیت کا مالک تھا لیکن اس کے باجود آج تک کسی لڑکی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس سے کوئی فالتو بات کر سکے۔

سوائے ایک کے۔

اور وہ تھی حالیہ آرمی ائیر چیف جنرل اقبال حمید کی لاڈلی اکلوتی بیٹی۔ لویزا اقبال۔ جو بی ایس سی کے فرسٹ ائیر میں تھی۔

وہ بے تحاشا حسین اور خوبصورت تھی۔ متناسب قد، سرخ و سفید رنگت، سانچے میں ڈھلا نازک مومی سا وجود، تیکھے نقوش۔ حسن کی ایسی کامل مورت ہونے کے باجود آج تک پوری یونیورسٹی میں کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ لویزا اقبال حمید کے پاس بھی

پھٹکے۔ نا آج تک اس سے کوئی الجھا تھا۔ کیوں نہیں الجھا تھا۔ وہ پوری یونیورسٹی جانتی تھی۔

اور وہ ایک ہی اس کا سر درد بن گئی تھی۔ اسے اس سے خاص طرح کی بلا وجہ کی چڑ تھی۔ یہ چڑ کیوں تھی اسے خود نہیں معلوم تھا حالانکہ کی تو اس نے بھی کبھی کوئی فالتو بات نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے آس پاس ہوتی تھی تو رانا میر ہادی کو عجیب سی کوفت و بیزارگی ہوتی تھی۔

اب بھی وہ جو کیمسٹری میں ایم ایس سی کے فرسٹ ائیر میں تھا جونئیر کی منت ترلوں کے بعد ان کے پروجیکٹ میں ضروری پوائنٹ بتا رہا تھا جب لائبریری میں ہائی ہیل کی ٹک ٹک کی مخصوص آواز گونجتی رانا میر ہادی کے ماتھے پر بلوں کا جال بچھا گئی۔ لیڈیز پرفیوم کی فضا معطر کرتی خوشبو اس کے آنے سے پہلے ہی لائبریری کے اس حصے کو مہکا گئی۔ جینز کے کھلے پلازو کے اوپر وہ پستہ کلر کی لونگ ٹی شرٹ پہنے سکارف کو گلے میں ڈالے حسب معمول اپنے لاپرواہ سے حلیے میں

بھی غضب ڈھا رہی تھی لیکن رانا میر ہادی نے ناگواری سے اس کا یہ اول جلول سا حلیہ دیکھا اور فوراً نگاہ پھیر لی۔

"ہیلو گائیز۔ کیا ہو رہا ہے یہاں، وہ دلکشی سے مسکراتی بولی۔ اور گروپ کے تھوڑا قریب آ گئی۔ "سر اجمل نے کہا کہ اپنے پراجیکٹ کے ضروری پوائنٹس میں بھی آپ سے پوچھ لوں، اسی لیے آپ کا پوچھ کر ادھر ہی چلی آئی۔" اس نے بڑے پرسکون اور بااعتماد

انداز میں کہا تھا۔ مگر اس کی اگلی بات پر رانا میر ہادی

کا دماغ گھوم گیا۔

"سوری گائیز، ابھی میں اپنے پروجیکٹ کے پوائنٹس

پوچھوں گی تو آپ لوگ بعد میں پوچھ لینا۔" وہ مسکرا کر

پورے سکون سے کہتی ٹیبل کے پار میرا ہادی کی

سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کوئی کہیں نہیں جائے گا، آپ لوگ آج ہی اپنے

پوائنٹس کلئیر کریں، کیونکہ کل میرے پاس وقت

نہیں ہوگا. اور آپ برائے مہربانی کسی اور پروفیسر یا

سنئیر سے رجوع کریں کیونکہ میرے پاس 'آپ' کے لیے بلکل وقت نہیں۔"

وہ سرد و سپاٹ سے لہجے میں آپ پر زور دیتا قدرے رکھائی سے بولا تو لویزا کے بشاش چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا پل میں مسکراہٹ حسین ترین چہرے سے غائب ہو گئی۔ اس نے لبوں سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اپنے جونئیرز کو اس قدر خونخوار نگاہوں سے گھورا تھا کہ۔

"ہادی بھائی، ہم نے جو سمجھنا تھا سمجھ لیا، آپ کا بہت بہت شکریہ ، باقی کا کام ہم خود کر لیں گے۔"

ان میں سے ایک لڑکی نے کہا اور اپنا سامان سمیٹ کر وہ لوگ جلدی سے وہاں سے نکل گئے تھے۔

تب میر ہادی بھی جلتا سلگتا اپنا سامان وہاں سے سمیٹنے لگا۔

"آپ میرے ساتھ ایسا بیہیو کیوں کرتے ہیں رانا میر ہادی؟ آپ سب کی ہیلپ کرتے ہیں تو میرے ساتھ اتنے روڈ کیوں ہیں؟ ایسا کیا کیا ہے میں نے؟" آخر کار آج وہ تنگ آ کر اس سے اس کے عجیب ترین رویے کی وضاحت مانگ ہی بیٹھی۔ سپاٹ سا لہجہ تھا۔

رانا میر ہادی نے بھی ایک آئبرو اچکا کر اس کی جانب دیکھا۔

"محترمہ آپ بھی تو یونیورسٹی میں کسی کو منہ نہیں لگاتیں،آپ کا کوئی دوست نہیں ہے نا کوئی لڑکا نا کوئی لڑکی اور ہر بار مجھ تک خود چل کر آ جاتی ہیں؟ کیوں؟ تو میرے ساتھ ایسے اسپیشل بیہیوئیر پر آخر میں کیا سمجھوں؟

وہ کون سا کم تھا؟ اسی لئے آگ کے ڈھیر پر بیٹھے اس سے بھی اس کی عجیب ترین برتاؤ کی وجہ پوچھ ہی لی۔

تب وہ ٹھٹھکنے کی بجائے جب دلکشی سے مسکرائی تو رانا میر ہادی ضرور ٹھٹھک گیا تھا۔

تو مطلب آپ مجھے نوٹ کر رہے تھے۔" اس کی مسکراہٹ بڑی فاتحانہ قسم کی تھی رانا میر ہادی تو گویا سلگ اٹھا۔

"میں وہ بیان کر رہا تھا جو یہاں سب کو نظر آ رہا ہے، اور سب عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔" وہ دانت پیس کر بولا تھا۔

آپ کے ساتھ یہ اسپیشل بیہیوئیر اس لئے کہ آپ "
بہت اسپیشل ہیں، اتنے اسپیشل کے لویزا اقبال کو
خود چل کر آپ کے پاس آنا پڑتا ہے۔" کچی محبت کا
دلفریب سا خمار آنکھوں میں بھر کر کہتی وہ اسے
سناٹوں کی زد میں لے آئی تھی۔

"کیا مطلب ہے آخر اس بات کا؟" وہ بھڑک اٹھا۔

"آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں میں کیا کہنا چاہتی
ہوں، اب جان بوجھ کر انجان بنتے رہیں تو وہ الگ بات

ہے۔" وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہتی رانا میر

ہادی کو زہر سے بھی زہر لگی۔

میں سچ مچ نہیں سمجھ پا رہا آپ کہنا کیا چاہتی ہیں"

آج کھل کر سیدھی طرح کہہ ہی دیں تاکہ مجھے بھی

اندازہ ہو جائے آپ کے اس (کند) دماغ میں آخر چل

کیا رہا ہے۔"آخر اس نے پتھریلے سے لہجے میں پوچھ

ہی لیا تب لویزا اقبال نے نرم گرم سے جذبوں کی چمک

آنکھوں میں بسائے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"میں سیدھی طرح آپ کو پرپوز کر رہی ہوں رانا میر ہادی، مجھ سے شادی کریں گے؟" وہ کہتے فطری شرم و حیا کے باعث جھجھک گئی تھی۔ مگر آج آخر اس نے اپنے دل کا حال اس کٹھور کے سامنے بیان کر ہی دیا تھا جو آنکھوں کی زبان سمجھنے کو بلکل تیار نہیں تھا۔ جب وہ اس کی بات سن کر بھونچکا سا لال بھبھوکا چہرہ لیے اپنی جگہ پر سن ہو گیا۔

"میں خواتین کی بہت عزت کرتا ہوں لویزا اقبال، اسی لیے آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ آپ یہ ذہنی اختراع اپنے

تک محدود رکھیں تو بہتر ہوگا نہیں تو بہت بڑا نقصان اٹھائیں گی، اپنے قدم اس راہ پر پڑنے سے پہلے ہی واپس موڑ لیجئے کیونکہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں، ویسے بھی میری منگنی تو میرے بچپن میں ہی ہو گئی تھی ، اپنی منگ کو بے حد پسند کرتا ہوں میں ، جلد شادی کا انویٹیشن مل جائے گا آپ کو۔"

وہ کہتا وہاں رکا نہیں تھا۔ وہاں سے نکل گیا تھا۔ لیکن لویزا اقبال کو ایک اندھی کھائی میں دھکیل گیا جہاں پر

اپنی نامراد و ناتمام ادھوری یک طرفہ محبت کے مقبرے میں اپنے دل کو دفنانا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے وہاں سے نکلی تھی۔ وہ ایسی حور شمائل نازک پری تھی جو کسی بھی دل کو فتح کر سکتی تھی لیکن بدقسمت ایسی کہ اپنے محبوب کی نگاہوں میں معتبر نا ٹھہری۔

اسے ڈرائیور لینے آ گیا تھا۔ لگژری ترین گاڑی آتے ہوئے وہ کھڑکی کے پار ایسے دیکھ رہی تھی جیسے دریا میں اس کے ایک پاؤں کا جوتا گر گیا ہو اور اسے ایک جوتے کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ کتنی سبکی ہوئی ایک

پاؤں میں جوتا پہن کر۔ ایک ننگے پاؤں سے چل کر۔ اچھا ہوتا وہ دوسرا جوتا بھی اتار پھینکتی۔ یک طرفہ محبت ایک پاؤں میں پہنے جوتے کی طرح ہوتی ہے۔ نہ ٹھیک سے چلا جاتا ہے اور نا اسے اتار کر پھینکا جا سکتا ہے۔

بھائی آپ کے لیے ایک اور محبت نامہ اور یہ پھول آئے ہیں۔" وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تھا جب اس کے چھوٹے بھائی رانا شامیر زریاب نے اپنا لب دانتوں تلے دباتے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ لیے اسے

اطلاع دی تو وہ غیض و غضب کی انتہا سے اپنے لب بری طرح بھینچ کر رہ گیا۔

آج کے بعد یقیناً یہ محبت نامے بھیجنے والے کی" خراب طبیعت کو افاقہ آ جائے گا، آج کے بعد یہ بکواسات کبھی نہیں آئیں گے۔" اس نے اچٹتی سی نگاہ ان کارڈز، خطوط اور پھولوں پر ڈالی جو شامیر الماری سے نکالے بیٹھا تھا۔ بیزارگی سے پھولوں کا بوکے اٹھا کر ہمیشہ کی طرح ڈسٹ بن کی نذر کیا۔

اس کا مطلب آپ جان چکے ہیں وہ دیوانی ہستی" کون ہے جو آپ کو اس طرح مجنوؤں کی طرح چاہتی ہے۔" شامیر نے ہنستے ہوئے پر مزاح انداز میں کافی مضحکہ خیز تشبیہ ملائی لیکن اس کی مکدور طبیعت پر پھر بھی کوئی اثر نا ہوا۔ لیکن شامیر کی بات پر ایک نگاہ غلط ان کارڈز پر ضرور ڈالی تھی جن پر لویزا اقبال کی رائٹنگ میں مختلف محبت بھرے پیغامات لکھے ہوئے تھے۔

اسے اس لڑکی کی ٹین ایجرز حرکتوں کی وجہ سے پورے خاندان میں کتنی سبکی کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی یہ تو وہی جانتا تھا جب یہ بو کے، کارڈز اور خطوط نامعلوم پتے سے حویلی تک میں آنے لگے تھے۔ منہ پر کسی کو کچھ کہنے کی جرات نا تھی مگر وہ جانتا اس کی پیٹھ پیچھے کافی باتیں افواہوں کی صرف گردش کر رہی ہیں۔

پتہ بھی چل گیا اور محترمہ کے ہوش ٹھکانے بھی لگا" دیئے۔" وہ دانت پیس کر بولا تھا۔ شامیر اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

"بھائی آپ ہیں کر رہے ناقدری یوں کی محبت ویسے،

حالانکہ بہت آسانی سے اس خاندانی بے جوڑ شادیوں

کے گندے نظام کو پوری طرح بدل سکتے ہیں آپ،

بخت آپی کتنی بڑی ہیں آپ سے، پورے آٹھ سال

آپ کی آنٹی لگتی۔"

"شٹ اپ شامیر، فضول بکواس بند کرو، وہ سلگ اٹھتا

تھا۔ "مرد کی دی گئی زبان بھی کوئی چیز ہوتی، وہ

منگ ہے میری، بچپن سے منسوب ہے مجھ سے،

میرے بڑوں نے زبان دے رکھی ہے اس کے گھر

والوں کو، تم بڑوں کی باتوں میں نا ہی پڑو تو بہتر ہے۔" میر ہادی نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ میر ہادی سر جھٹکتا اپنے بیڈ روم میں چلا آیا۔ اور پھر واقعی اگلے پورے ہفتے اسے وہ کارڈ اور پھول موصول نہیں ہوئے تھے جن کی شاید اسے عادت ہو چکی تھی۔ لیکن وہ یہ بات کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔

وہ اگلے دن یونیورسٹی آیا تھا۔ اسے تو پتہ بھی نا چلا اس کا لاشعور اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن وہ کہیں پر دکھائی نا دی تو اسے عجیب لگا تھا۔ اس وقت وہ علی کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا۔ علی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن وہ غائب دماغی کے عالم میں وہاں بیٹھا رہا۔

اگلے تین دن وہ یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ رانا میر ہادی کو پتہ تھا کہ وہ کتنے دن یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ تعجب کی بات تھی کہ اسے ان دنوں کی تعداد یاد تھی۔ وہ علی کے ساتھ کلاس میں بیٹھا تھا۔

یہ چیف صاحب کی بیٹی لویزا اقبال یونیورسٹی نہیں آ" رہی، وجہ معلوم ہے تمھیں علی۔" میر عادی نے سرسری سے انداز میں علی سے پوچھا تھا۔

پتہ نہیں، کسی کو نہیں معلوم، اس کی کون سا" کوئی دوست ہے جو یہاں بتائے گی کہ وہ کیوں نہیں آ رہی۔" علی نے لاپروائی سے کہا۔ " لیکن ایک منٹ یہ تمھیں اتنی کیوں فکر کو رہی ہے، کوئی چکر وکر تو نہیں۔" علی نے ذو معنی انداز میں پوچھا تو وہ چڑ گیا۔

"علی ہر بات کا لوٹ پھیر کر یہی مطلب ہوتا ہے، کوئی انسانیت کی خاطر کسی کے بارے میں نہیں پوچھ سکتا۔" وہ شدت سے چڑ چکا تھا۔ علی اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

"مزاق کر رہا تھا یار، اچھا چھوڑو کینٹین چلتے ہیں۔" علی نے اس کے غیر معمولی بگڑے موڈ کی وجہ سے بات ہی پوری طرح گھما دی۔ وہ بھی سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے طویل و عریض بنگلے کے اپنے بیڈ روم میں سیاہ ٹی شرٹ ٹراوزر میں گھنے ڈارک براؤن بال کمر پر بکھرائے وہ کھڑکی میں بیٹھی باہر کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ بخار سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ بخار جسمانی تھا یا روحانی۔ اسے سمجھ نا آئی۔ یونیورسٹی میں اس کا کوئی خاص دوست نہیں تھا۔ ہاں وہاں جاتے ہیں اس کی نظر ٹھہری تھی تو ایسے شخص پر جس نے بلا وجہ اس سے ہمیشہ نفرت کی تھی۔ بہت سبک رفتاری سے وہ شخص محبت بن کر دل میں بھنے

لگا تھا۔ محبت کی جڑیں روح تک پھیل گئیں تب خود پر کوئی اختیار نا رہا۔ اسی لیے تو اپنی نسوانیت کو ایک طرف رکھے خود جا کر اس سے اظہار بھی کر دیا۔ وہ جانتی تھی وہ اسے پسند نہیں کرتا لیکن اس کے اتنے شدید

رد عمل کی بھی کہاں توقع تھی۔

اس نے میڈیسن لی تھی مگر کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ جب ہلکی دستک دے کر کوئی اندر داخل ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے بابا تھے جو مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اقبال حمید فل

یونیفارم میں موجود اب قریب آ کر اس کے ساتھ کاٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ اس کا سر تھام کر اس کا ماتھا چوما۔

میرا لیز کا پیکٹ کیوں اتنا اداس ہے بھئی۔" اقبال" نے اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کی آنکھوں میں نرمی سے جھانکا تھا جہاں انھیں کلیجہ چیر دینے والی ویرانی، خالی پن اور عجیب طرح کی توڑ پھوڑ سی نظر آئی تو وہ تڑپ اٹھے تھے۔ اگر ماں حیات ہوتی تو وہ شاید اپنے دل کی بات

ماں سے بانٹ لیتی مگر ایسی کون سی بات تھی جو وہ اپنے دل میں دبائے بیٹھی تھی۔

"کچھ نہیں بابا، بس ایسے ہی، ٹاپ کرنے کے چکر میں کچھ زیادہ اوور تھنکنگ کرنے لگی ہوں۔" اس نے کہتے ان سے بری طرح نگاہیں چرائیں تھیں۔ اور یہ زندگی میں پہلا ایسا موقع تھا کہ وہ اپنے بابا سے نگاہیں چرا رہی تھی۔ نہیں تو آج تک ایسا موقع کبھی آیا نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی ہر ضد منوانے والی وہ ضدی لڑکی آج اپنی محبت سے دستبردار ہو کر تھی

دامن ہو بیٹھی تھی۔ اس کے بابا نے اس کا جھکا چہرہ اپنی جانب گھمایا اور ایک مرتبہ پھر اس کی کتھئی آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر خواہش کے جگنو ہاتھوں سے پھسل کر آپ کی زندگی کو اندھیر کرنے لگیں تو ان جگنوؤں کو تقدیر سے چھین کر قسمت کی چادر سے نوچ کر اپنی مٹھی میں قید کر لینا چاہیے۔" انھوں نے جس انداز جس لہجے میں اس سے کہا تھا لویزا کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

بابا؟" وہ سناٹوں کی زد میں آئی لرزتی آواز میں بولی۔"

"Take care of yourself, my child."

وہ کہتے رکے نہیں وہاں سے نکل گئے تھے۔

طبیعت کافی بوجھل تھی۔ بخار اب بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اگر بے حد ضروری اسائمنٹ جمع نا کروانی ہوتی تو وہ کبھی یونیورسٹی کا رخ نا کرتی۔ کاپر کلر کے ٹراوزر

لونگ ٹی شرٹ میں ہم رنگ سکارف گلے میں ڈالے وہ اپنی کلاس میں الگ تھلگ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ اسائمنٹ جمع کروا دی تھی۔ آہستہ آہستہ سب اسٹوڈنٹس کلاس سے باہر نکل گئے۔ لویزا کے سر میں شدید درد اٹھا۔

وہ اپنے سرخ ہاتھوں سے اپنی دونوں کنپٹیاں سختی سے دبائے ہوئے تھی۔

وہ یونیورسٹی آیا۔ ڈارک گرے تو پیس میں ڈرائیو وے پر اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جب اندر آتی ایک گاڑی نے اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف جانب کھینچ لی۔ اسے یاد تھا آج وہ تقریباً ایک ہفتے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ وہ اس گاڑی سے اتری تھی۔ بہت لاپرواہ ، پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ سرد و سپاٹ اور سرخ چہرہ لیے وہ رانا میر ہادی کی جانب ایک بھی غلط نگاہ ڈالے بغیر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب گئی تو میر ہادی کو حقیقتاً ایک دھچکا سا لگا تھا۔ نجانے کیا ہوا تھا وہ اپنی کلاس

میں جا نہیں پایا تھا۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر پھرتا رہا۔ تجسس تھا؟ کوئی وہم کوئی سوال؟ یا جانے کیا۔ کہ اگلے کچھ وقت میں وہ بی ایس سی کے ڈیپارٹمنٹ میں اس کی کلاس کے سامنے تھا۔ تمام سٹوڈنٹس باہر نکل گئے تھے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے کلاس میں داخل ہوا تو وہ اپنی مخصوص جگہ پر سرخ چہرہ لیے اپنے گلابی ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں مسل رہی تھی۔ ایک مخصوص سی خوشبو اور آہٹ اپنے قریب محسوس کر کے لویزا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت یہاں کسی کی بھی

توقع کر سکتی تھی سوائے اس شخص کے سو آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھیل گئیں۔ ادھر وہ ہونق سا اپنی جگہ پر سن کھڑا تھا جب کچھ نا بن پڑا تو۔

مسز لویزا اقبال وہ کارڈز، پھول اور خطوط آپ مجھے بھیجتی رہی ہیں؟" اس نے بے تاثر لہجے میں پوچھا اور سامنے بیٹھی کومل نازک سی لڑکی کا تیزی سے پھیکا پڑتا حسین ترین چہرہ دیکھ دل میں ایک کمینی سی خوشی ہوئی۔

معزرت چاہتی ہوں وہ میری نادانی تھی، آئندہ آپ کو" شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" اس کا لہجہ بیشک سپاٹ تھا لیکن الفاظ بمشکل گلے سے پھنس پھنس کر ادا ہوئے رانا میر ہادی کو سخت بدمزہ کر گئے۔ اس کا اتنی جلد پسپائی اختیار کرنے کا انداز اسے ایک آنکھ نا بھایا تھا۔

"ایسی کیسی نادانی محترمہ، آپ کو اندازہ بھی آپ ان کی ان بچکانہ حرکتوں سے خاندان بھر میں میری کیسے

کیسے انسلٹ ہوئی ہے۔" میر ہادی کو اندازہ تک نا تھا

کہ وہ خواہ مخواہ بات کو طول دے رہا ہے۔

"میں معافی مانگ چکی ہوں، اور بد قسمتی یہ ہے کہ گزرا

وقت واپس دہرا کر اپنی یہ غلطی سدھار نہیں سکتی۔"

اس کے اندر زہر پھیلنے لگا اس کا فگار دل یہ وار سہہ

نہیں پایا تھا اسی لئے وہ برداشت کی کون سی حد پر

کھڑی تھی مقابل کو لمحہ بہ لمحہ اس کا سفید پڑتا چہرہ

دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور

کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی جگہ اٹھا کر جانے لگی جب

بری طرح لڑکھڑا سی گئی۔ رانا میر ہادی نے بوکھلا کر اس کو اپنے مضبوط و آہنی بازو کے حصار میں لیتے تھاما تھا۔

آپ ٹھیک ہیں۔" لہجہ خود بخود دھیما پڑ گیا۔ جبکہ لویزا" اقبال کو اس کی یہ ہمدردی اور ترس اس وقت زہر کا پیالہ لگ رہے تھے۔

میں ٹھیک ہوں، آپ کی اس جھوٹی اور بناوٹی" ہمدردی کی ضرورت نہیں مجھے، آپ جا سکتے ہیں یہاں سے۔" وہ کھولتے اعصاب پر قابو پاتے زہر آلود لہجے میں بولی۔

ایک 'سراب' کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی برباد مت کریں لویزا اقبال۔" اس نے متانت بھرے لہجے میں سمجھانا چاہا۔ اسے اپنے حصار سے نرمی سے آزاد کر دیا لیکن اب بھی وہ دراز قد چوڑی جسامت کا خوبرو شخص اس کے سامنے آ انداز سے کھڑا تھا کہ وہ چاہ کر بھی کترا کر وہاں سے نکل نہیں سکتی تھی۔

"نہیں بھاگ رہی، آپ کی نصیحت کے مطابق اپنے قدم واپس لے لیے ہیں، اسی لیے ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ رہی ہوں، آپ بلکل بے فکر ہو جائیں

اب آپ تک آ کر کوئی آپ کو پریشان نہیں کرے گا۔" وہ کہتے کہتے ہانپ گئی۔ گلے میں ایک گولہ سا پھنس گیا۔ جبکہ میر ہادی اس کی بات پر ایک لمحے کو حق دق ہوا تھا۔۔

میم، سب خیریت ہے ناں؟ کوئی پریشانی کی بات تو" نہیں، آپ باہر کیوں نہیں آ رہی ہیں؟" لویزا کے باڈی گارڈ کی خطرناک سی آواز سنائی دی تو لویزا کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ میری ہادی جو پیچھے

مڑنے لگا تھا لویزا نے تیزی سے اس کا گریبان پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

"پیچھے مڑ کر مت دیکھیے گا، میرے جانے کے بعد اس کلاس سے نکلنا ہے آپ نے۔" اس کا آگ کی طرح جلتا ہاتھ میر ہادی کے سینے سے ٹکرایا تو وہ کچھ لمحوں کو لیے تو سانس تک لینا بھول گیا تھا۔ وہ ہوا کا جھونکا بنی وہاں سے تیزی سے نکل گئی تھی۔ لیکن رانا میر ہادی جیسے وہاں پتھر کی مورت بنا کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"سر، لیزا بے بی اپنے کمرے کا دروازا نہیں کھول رہی ہیں۔" اقبال حمید جب گھر لوٹے تو سامنے سے لویزا کا بچپن سے خیال رکھنے والی آیا اماں بی نے انھیں یہ اندوہناک خبر سنائی تو اقبال حمید پریشانی سے اپنی لاڈلی کے کمرے کی جانب لپکے۔ ماسٹر کی سے انھوں نے بڑی تیزی سے دروازا کھولا تھا۔ سامنے کا منظر اتنے بہادر اور دلیر آدمی کا بھی کلیجہ چیر گیا تھا۔ کہ

ان کی لاڈلی گھڑی بنی زمین پر بیہوش پڑی تھی۔ وہ اسے اٹھائے تیزی سے ہاسپٹل کے لیے نکلے تھے۔

بچی کو نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے اقبال اور وہ بیہوشی" میں مسلسل ایک نام پکار رہی ہے۔" اقبال حمید کے دوست نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ تو وہ گہرے سمندر کی طرح بلکل خاموش تھے۔

روم میں شفٹ ہونے کے کافی دیر بعد وہ ہوش میں آئی تھی۔

لیزا میری بچی۔" اقبال حمید نے جھک کر اس کے ماتھے پر پدرانہ شفقت سے چور ہو کر اپنے لب رکھے تو وہ نیم غنودگی میں بھی مسکرا دی۔

"میں ٹھیک ہوں بابا، دوست سے جھگڑا ہو گیا تھا بس اسی لیے ۔" (چور کی داڑھی میں تنکے کے مترادف) وہ سب سے پہلے وضاحتیں دینے لگی تو اقبال صاحب دھیمے سے مسکرا دیئے۔

"ہم یہ جھگڑا جلد سلجھا دیں گے میرا بچہ، تم فکر مت کرو۔" انھوں نے نرمی سے کہا تو لویزا نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"اس کی ضرورت نہیں پاپا، آپ بس مجھے نانو کے پاس ترکی بھجوا دیں، میں کچھ عرصہ انھیں کے پاس رہنا چاہتی ہوں، وہاں یونیورسٹی میں میری مائیگریشن کروا دیں۔" اس کے ہمیشہ کی طرح ضدی سے انداز میں کہا تو اقبال صاحب ہنس دیے۔

جیسے میرا بیٹا کہے گا ہم ویسے کریں گے۔" انھوں نے پھر سے کہتے اس کا ماتھا چوما تو لویزا نے پرسکون ہو کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

اس کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے۔ وہ بخت کو ڈھیر ساری شاپنگ کے ساتھ شادی کا جوڑا دلوا کر لایا تھا وہ دونوں اس وقت میرے ہادی کے فلیٹ میں ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔

لگتا ہے آپ کی اس ناکام دیوانی کو بھی ہماری "
شادی کا پتہ چل چکا ہے اسی لیے تو اتنے دن سے
آپ کے لیے پھولوں کے ڈھیر نہیں بھیجے۔" بخت نے
کافی نخوت اور حقارت سے کہا تھا۔ رانا میر ہادی نے
چونک کر اسے دیکھا۔

"اتنی خوشی کے موقع پر تم کیا لے کر بیٹھ گئی ہو۔"
وہ قدرے بگڑ کر بولا تو بخت فورا سنبھل گئی تھی۔

میں تو مزاق کر رہی تھی آپ تو برا مان گئے۔" اس"
نے لہجے میں مٹھاس بھرتے کہا تھا لیکن رانا میر ہادی

کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ شامیر ان کے لیے کافی لایا تھا۔

"کافی پی کر اپنی بھابھی کو ان کے گھر چھوڑ آنا، مجھے کچھ ضروری کام ہے۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ایک انجانی سی کسک تھی جو سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔ لیکن کیا؟ اس کو سمجھ نا آیا۔ سب کچھ من کر کے مطابق ہو رہا تھا مگر دل میں کوئی بھکتے مچلتے نوخیز سے جذبات سر نا اٹھاتے تھے۔ وہ شادی کی تیاریاں

کافی مشینی انداز میں کر رہا تھا۔ پھر آخر اس کی مہندی کا دن آن پہنچا تھا۔

وہ اس وقت حویلی میں اپنے بیڈروم میں تیار ہو رہا تھا۔

دراز قد سرخ و سفید رنگت تیکھے خوبرو نقوش اوپر سے اس وقت سفید کلف لگے شلوار قمیض میں وہ مردانہ وجاہت کا شہکار خود پر مخصوص پرفیوم سپرے کرنے کے بعد گھنی مونچھوں کو سیٹ کر رہا تھا جب گارڈز علی کمرے میں آیا۔

"میر ہادی شامیر کو تم نے کہیں بھیجا ہے کیا؟ دو گھنٹے ہو چکے ہیں، نظر نہیں آ رہا۔" علی نے اسے کہا تو وہ بری طرح چونکا تھا۔ واقعی شامیر اسے کافی دیر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے اپنا فون اٹھا کر اسے کال ملائی تھی۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ شامیر کا فون بند جا رہا تھا۔ اب میر ہادی کو پریشانی ہونے لگی۔ اس کے سب دوست تو یہاں موجود تھے خود کہاں چلا گیا۔

میر ہادی اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ پوری حویلی میں شامیر کی پکار پڑ گئی تھی مگر وہ کہیں ہوتا تو دکھتا۔ اس

کے بعد پورے ڈیڑھ گھنٹے پریشانی کے گزر چکے تھے شامیر کا کہیں پتہ نا چلا۔ میر ہادی پورے علاقے کی خاک چھان آیا تھا مگر شامیر کا کچھ اتہ پتہ نا چلا۔ وہ پریشانی کے عالم میں حویلی آیا تھا جب اس کے فون پر بختاور کی کال آئی۔ اسے حیرت ہوئی تھی ۔ پھر بھی اپنے تاثرات پر قابو پاتے اس نے کال ریسیو کی مگر سامنے سے اسے پھکوں پھکوں روتے سن میر ہادی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

"کیا ہوا بخت، رو کیوں رہی ہو؟ سب خیریت ہے نا۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں میر ہادی، پاپا اور بھائی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے، وہ لوگ کسی کام سے باہر گئے تھے، کوئی پتہ نہیں کون لوگ تھے لیکن پاپا اور بھائی کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔" وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی جبکہ میر ہادی گم صم سا اپنی جگہ پر پتھر بن گیا۔ تو کیا شامیر کو بھی کسی نے اغوا ہی کیا تھا؟

تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں سب" ٹھیک کر دوں گا۔" میر ہادی نے اسے تسلی دی اور فون رکھ دیا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب کال رکھتے ہیں اس کے فون پر کسی ان ناون نمبر سے کال آنے لگی تو وہ اس نے پریشانی سے پہلو بدلتے اٹھا لیا۔

یہ شادی توڑ دو اور اپنا رشتہ لویزا اقبال کے گھر فوری" طور پر بھیجو، اس شادی سے انکار کر دو تو تمھارا چھوٹا بھائی اور نا ہونے والے سسر اور سالہ گھر سہی

سلامت پہنچ جائیں گے، کوئی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو اگلی مرتبہ دلہن اٹھائی جائے گی۔"

کمپیوٹرائزڈ ریکارڈڈ میسج تھا۔ جو رانا میر ہادی نے علی کو بھی سنایا تھا۔ دونوں کے سروں پر حویلی کی چھت گر گئی تھی۔

اور پھر اسے اپنی شادی توڑنی پڑی کیونکہ پولیس کے لاکھ ایڑھیاں رگڑنے کے باجود وہ تینوں کہیں سے بھی بازیاب نہیں ہو پائے تھے۔ شدہ توڑنے کے چھ گھنٹے بعد وہ تینوں گھر لوٹ آئے تھے۔ شامیر کو کوئی راہ گیر

گھر چھوڑ کر گئے تو وہ بیہوش تھا۔ اسے کوئی علم نہیں تھا اسے کس نے اٹھایا تھا مگر رانا میر ہادی کو اچھے سے علم ہو چکا تھا تبھی وہ یونیورسٹی آیا تھا بڑی مشکل سے وہاں پروفیسر سے نمبر لے کر اس نے اس کو کال ملائی۔

رانا میر ہادی کو اگلا گمنام ملنے والا میسج اس سے بھی کئی گناہ زیادہ عذاب ناک تھا۔ انا مجروح ہوئی اور عزتِ نفس بلبلا اٹھی۔

گڈ بوائے، اب شادی توڑ دی ہے تو چپ چاپ اسی "مبارک منہ سے لویزا اقبال حمید کو پرپوز کرو جا کر۔"

ایک انا زادے کی انا پر پاؤں پڑا تھا وہ بلبلاتا کیوں نہیں۔ اس کی زبردستی شادی توڑنی گئی تھی۔ آج تک اسے لگتا تھا کوئی ایسا نہیں جو رانا میر ہادی جیسے اتھرے گھوڑے کو قابو کر سکے یا اس سے زبردستی کوئی کام کروا سکے۔ لیکن اب اس سے زبردستی کی گئی تھی۔ اسی لیے وہ آگ کا ڈھیر بنا سب کچھ تہس نہس کرنے کے در پے تھا تبھی اسے کال ملائی تھی۔

لویزا دل میں ڈھیروں درد اور تکلیف لیے پژمردگی سے اپنا بیگ پیک کر رہی تھی جب اس کا موبائل فون مسلسل گنگنایا۔ لویزا نے چیزیں ایک طرف رکھ کر فون اٹھایا تو دل کانوں میں دھڑک اٹھا۔ وہ ایک نمبر تھا جو بھلے موبائل کی کونٹیکٹ لسٹ میں سیو نہیں تھا مگر دل میں تو سیو تھا۔ نمبر کا ایک ایک ہندسہ اسے ازبر تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال اٹھائی۔

اسلام وعلیکم، کون؟" اس نے پھر بھی انجام بننا" منسوب سمجھا۔

لویزا اقبال میں رانا میر ہادی بات کر رہا ہوں تم سے"
ابھی اسی وقت ملنا چاہتا ہوں، کیا ابھی یونیورسٹی آ سکتی
ہو؟ میں تمھارا لائبریری میں ویٹ کر رہا ہوں۔" اس
کے الفاظ دلفریب تھے محبت کا دل کانوں میں
دھڑکاتے ہوئے مگر لہجہ بہت ظالم تھا۔ مگر لہجے پر
یہاں غور کون کر رہا تھا وہ تو اس کی اتنی بات سن کر
ہی ہواؤں میں اڑنے لگی تھی کچھ جو اس نے آپ سے
تم تک کا سفر ایک فون کال میں طے کیا تھا وہ پیر
زمین پر کہاں لگنے دے رہا تھا۔

لیکن میری تو ابھی کچھ دیر بعد کی فلائٹ ہے۔" لویزا نے دھیمے سے کہا لیکن ادھر اس کے اتنے بھولے بننے پر رانا میر ہادی کے اندر جوار بھاٹے اٹھنے لگے۔

"میں کچھ نہیں جانتا، میں ویٹ کر رہا ہوں، اگلے آدھے گھنٹے میں مجھے تم میرے سامنے یہاں ملو۔" اس نے اپنی سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ لویزا نے سرشاری سے مسکراتے فون سینے سے لگایا۔

"یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟" وہ حیران تھی۔ وہ اپنی الماری کی طرف لپکی اور خوبصورت سا برینڈڈ اولیو گرین

کلر کا جوڑا زیب تن کیا۔ دوپٹہ گلے میں لیے لبوں پر ہلکی سی پنک لپ سٹک لگائے آج وہ پہلی مرتبہ اتنے دل سے تیار ہوئی تھی۔ کھلا پلازو اور اوپر گھٹنوں تک کرتی میں دودھیا رنگ چاندی کی طرح دمک اٹھا سانچے میں ڈھلا پری پیکر وجود متناسب قد وہ اتنی سی تیاری میں ہی غضب ڈھا رہی تھی۔ وہ اپنا کلچ اور موبائل اٹھائے جلدی سے کمرے سے باہر نکل کر پورچ تک پہنچی۔

آج عجیب بات ہوئی تھی کہ اس کے باڈی گارڈ نامی

دم چھلا اس کے ساتھ نہیں لگا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرتی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھی۔

وہ لائبریری کے مخصوص ٹیبل پر بیٹھا اپنی لال انگارا ساحری آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمائے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا جب لیڈیز پرفیوم کی مخصوص خوشبو سانسوں سے ٹکرائی تو کشادہ ماتھے پر بلوں کا قہر ڈھاتا جال بچھ گیا۔ لویزا جھجھکتے اس کے سامنے آئی۔

اسلام و علیکم۔" اس نے مترنم نرم آواز میں کہا۔ میر" ہادی نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا تو وہ اس کے اتنے ہولناک تاثرات دیکھ کر دھک سے رہ گئ۔ لہو چھلکاتی چہرہ سرخ انگارا آنکھیں ۔ بھنچے جبڑے اور کنپٹی پر پھولیں ہوئیں رگیں۔

کیا ہوا میر ہادی سب ٹھیک ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں" ناں۔" وہ مسلسل اسے خود کو ایسے دیکھتے دیکھ روہانسی ہوتی گھبرا کر بولی۔

پرسوں میری شادی تھی۔" رانا میر ہادی نے سپاٹ سے لہجے میں کہا تو لویزا کے سر پر یونیورسٹی کی چھت سی گر گئی۔ لیکن

لیکن عین مہندی والے دن میرے بھائی اور میری ہونے والی بیوی کے باپ اور بھائی کو اغوا کر لیا گیا، اور مجھے فون سے ان ناون نمبر سے دھمکایا گیا کہ میں وہ شادی توڑ دوں، نا صرف شادی توڑ دوں بلکہ تمھیں شادی کے لیے پرپوز کروں، یہ سب تم نے کیا ناں؟" وہ قہر ڈھاتے پراسرار سے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور لویزا

کی سانسیں اس کے سینے اٹک گئیں ہاتھ پیر سن ہو گئے۔ چہرہ تیزی سے سفید پڑنے لگا۔

"نہیں، بلکل نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں ک۔"

وہ ابھی بول ہی رہی تھی کہ اپنی جگہ سے سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ کیونکہ رانا میر ہادی نے پاؤں کی دھماکے دار ضرب سے ٹیبل کرے پھینکا تھا۔

"اپنی شادی توڑ کر تمھیں پرپوز کرنے کا حکم نامہ ہو اور تم اس میں انوالو نہیں، میرے ماتھے پر پاگل لکھا ہوا ہے؟ "یہ تم نے کیا ناں؟ خود کو سمجھتی کیا ہو؟ ذرا

طاقت کے نشے کی مدہوشی سے باہر نکلو تو تمھیں اپنی دو ٹکے کی اوقات کا پتہ چلے، بلکہ نہیں وہ تو میں یعنی رانا میر ہادی ہی تمھیں بتا دیتا ہوں کہ لویزا اقبال میری نظر میں تم ایک دو ٹکے کی آوارہ، بد کردار اور بدذات لڑکی ہو، میری شادی تڑوا کر کیا سمجھتی ہو؟ میں تمھارا ہو جاؤں گا؟ بھول ہے یہ تمھاری میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر، تم پر ایک نظر ڈالنا گوارا نا کروں، نہیں کرنی تم سے شادی اب جاؤ جو بن پڑتا ہے تم سے وہ کر لو، یا اپنے اس طاقت ور باپ سے کہو تمھیں کوئی کاٹھ کا

الو خرید دے کیونکہ میں تو تم پر تھوکنا پسند نہیں کروں گا۔" وہ منہ سے آگ اگل کر وہاں رکا نہیں تھا وہاں سے نکل گیا تھا۔ جبکہ لویزا اقبال کو سہی معنوں میں آج علم ہوا تھا کہ الفاظ آسمان سر پر کیسے گراتے ہیں اور جسم کو نہیں روح کو مسمار کر دیتے ہیں۔ وہ کئی ثانیے پتھر بنی وہاں کھڑی رہی۔ چہرے پر کچھ گرم سیال مادے کا احساس ہوا تو پتہ چلا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا ہے۔

اس کٹھور پتھر دل نے اس کی روح کو ایسا کچوکا لگایا تھا ایسا درد دیا تھا کہ جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ مجھے ایسا سمجھتا ہے تو مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن نہیں جان دوں گی تو اس پتھر کے دیوتا کی نگاہوں کے سامنے۔ اسے بھی تو پتہ چلے شمع پروانے کی آگ میں جل مرے تو پروانہ ساری زندگی صرف سلگتا ہے۔ وہ پوری طرح پاگل ہو چکی تھی تبھی شعلہ جوالہ بنی وہاں سے تیزی سے نکلی تھی۔ لویزا راستہ گھما کر اس کی گاڑی کے سامنے اپنی گاڑی

لائی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی گاڑی کو گھما کر کھمبے میں دے مارنے کا پروگرام تھا۔ لویزا اقبال کا رانا میر ہادی کی آنکھوں کے سامنے اپنی جان دینے کا ارادہ پوری طرح سمجھتے ہوئے وہ اس کی جان بچانے کی خاطر اپنی گاڑی کو اس کی گاڑی کے سامنے لے آیا۔ رانا میر ہادی کی گاڑی کا اگلا حصہ لویزا کی گاڑی اور کھمبے کے درمیان آکر بری طرح کچلا گیا تھا۔

سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ آنکھیں بہت بھاری تھیں یوں لگتا تھا پپوٹوں پر من من بھاری پتھر رکھے ہوئیں ہیں۔

لیزا میری گڑیا ، میرا بچہ ، میری جان، آنکھیں کھولو" بیٹا۔" دور بہت ہی دور کہیں سے اسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو چیرتی اپنے بابا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہت دقتوں سے اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کھولیں تو اقبال حمید نم سرخ آنکھیں لیے اس کے چہرے پر جھکے ہوئے تھے۔

"پاپا، کیوں کیا؟ میر،، ہادی، میر،، ہادی،؟ ٹوٹے پھوٹے شکستہ الفاظ تھے۔ باپ سے شکوہ کر کے وہ اس ہرجائی کا نام پکارتے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اس کے پورے جسم پر اور سر پر چوٹیں تھیں۔ اس کا ریلیکس رہنا بہت ضروری تھا لیکن وہ اتنی ہی پینک ہو رہی تھی۔

"وہ بھی ٹھیک ہے لیزا میری جان وہ بلکل ٹھیک ہے، پہلے تم پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ، پھر اسے دیکھ لینا۔" اقبال حمید نے اسے تسلی دی۔ جلد وہ دواؤں

کی زیر اثر پھر سے گہری نیند میں چلی گئی۔ اس کے بعد اسے دو دن بعد پوری طرح ہوش آیا تھا۔ اس نے چیختے چلاتے پورا کمرا سر پر اٹھا لیا تھا۔ حالانکہ اس کا خود کا سر پٹیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا مگر اسے متعلق پرواہ نہیں تھی۔

مجھے میر ہادی کے پاس جانا ہے، اسے دیکھنا ہے، ہٹو" سامنے سے، وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی کوئی پاگل لگ رہی تھی۔ تب وہ نرس جو

سپیشل اس کے لیے ہائر کی گئی تھی اس نے اسے سنبھالا تھا۔

"چلیں ادھر وہیل چیئر پر بیٹھیں، میں ڈرپ اسی میں سیٹ کر دیتی ہوں، میں لے چلوں گی آپ کو اس کے پاس، لیکن شرط یہ ہے آپ نے پینک نہیں ہونا بس، ریلیکس رہیں لویزا ریلیکس رہیں بلکل۔" سسٹر سندس نے اسے تھاما اور حیرت انگیز طور پر اس نے سسٹر کی ہر بات مان لی۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھی۔ اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ اس کے کمرے کے ساتھ

والے کمرے میں ہی وہ دشمنِ جاں پٹیوں میں جکڑا مشینوں کی نالیوں کے بیچ بیڈ پر بیہوشی کی حالت میں چت لیٹا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پھر بے تحاشا رو پڑی تھی۔

"سسٹر ایک ہفتے بعد مجھے سہی طرح سے ہوش آیا ہے لیکن یہ؟ یہ ابھی تک ہوش میں کیوں نہیں آئے؟ کیا ہوا ہے انھیں؟ یہ ٹھیک تو ہیں ناں؟ وہ دہل اٹھی۔

"یہ کوما میں چلے گئے ہیں لویزا، آنے کو انھیں ابھی اسی وقت ہوش آجائے، نا آنے کو چاہے دس سال نا

آئے، کچھ نہیں کہا جا سکتا، ان کے دماغ کے پچھلے حصے پر چوٹ لگی ہے، ہوش میں آنے کے بعد بھی ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ یہ اپنی پچھلی زندگی پوری طرح بھول جائیں گے، ان کی یاداشت چلی جائے گی، آپ دعا کریں ان کے لیے کہ یہ جلد ہوش میں آ جائیں ،محبت کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے لیزا۔" سسٹر بول رہی تھیں اور لویزا کو لگا تھا اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ پڑیں گی۔ وہ بے تحاشا رو دی تھی۔ اگلے ایک ماہ میں لویزا اقبال پوری طرح صحت یاب ہو گئی

تھی مگر رانا میر ہادی کی حالت میں خاطر خواہ کوئی بہتری آتی محسوس نا ہوئی تھی۔ یہ پورا ایک ماہ لویزا نے اس شخص کی پٹی سے لگے بتایا تھا۔ پورا پورا دن وہ اس کے پاس بیٹھی اسے چپ چاپ دیکھتی رہتی۔

یہ ایک لگژری ترین اپارٹمنٹ تھا جس کے بیڈ روم میں رکھے ہاسپٹل بیڈ پر وہ مشینوں کے درمیان دنیا و مافیہا سے بیگانہ بیہوش پڑا تھا۔ وہ بیڈ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھی اسے ایک انگلش ناول سنا رہی تھی۔ پانچ ماہ

سے اس کی یہی روٹین تھی۔ وہ صبح کے وقت اسے تلاوت سناتی تھی۔ دوپہر کو مختلف قسم کے انگلش ناول اور رات کو اردو ادب کی کتب۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا وہ بیہوش ہے لیکن اس کے شعور جاگا ہوا ہے وہ سن سکتا ہے محسوس کر سکتا ہے۔ اسے خوش رکھیں اس کا خیال رکھیں کیئر کریں گے تو اس کے جلد ریکور ہونے کے زیادہ اچھے چانسز ہیں۔ اسی لیے وہ گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی تھی۔ اس تصوراتی دنیا کی باتیں جس میں وہ اس کا شوہر تھا اور وہ دونوں

محبت کے جھولے میں بیٹھ کر آسمان چھو آتے تھے۔

وہ تخیل کی دنیا جس میں لویزا اقبال اس کی بیوی تھی

اور اس نے اس شخص کا ہاتھ تھام کر ورلڈ ٹور کر رکھا

تھا۔ دنیا کے مختلف تفریحی مقامات کی سیر کر رکھی

تھی۔ اب بھی وہ سیاہ ٹراوزر ٹی شرٹ میں رف ٹف

سے حلیے میں بالوں کا اونچا سا جوڑا بنائے سیاہ سکارف

گلے میں ڈالے اسے بڑے مگن انداز میں ساتھ ساتھ

ناول پر تبصرے کرتے اسے مختلف سین سنا رہی تھی

جب اسے یوں لگا اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ لویز نے

گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ میر ہادی کے لیے ایک میل کئیر ٹیکر ہائر کیا گیا تھا۔ اماں بی سمیت ملازماؤں میںایک فوج تھی یہاں۔ لیکن اس وقت دروازے میں کوئی نہیں تھا تو وہ سر جھٹک کر پھر سے ناول پڑھنے لگی۔ اسے پھر سے وہی محسوس ہوا۔

لویزا نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تب زمین آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں میں ایک شوق کا جہان آباد کیے لویزا کی جانب بڑی نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"مم،میر ہادی، وہ چیخ پڑی۔ تڑپ کر اٹھ کر باہر بھاگنے لگی (ارادہ تھا فون کر کے کسی ڈاکٹر کو بلائے۔) جب اتنی ہی سرعت سے میر ہادی نے اس کی کلائی نرمی سے تھام لی تھی۔

"میرے پاس ہی بیٹھی رہو، یہ چیپٹر مکمل کرو بیوی، نہیں تو مجھے تجسس رہے گا کہ آگے کیا ہوا۔"

اس نے مسکرا کر نرمی سے کہا تو لویزا کو لگا ہفت آسمان اس کی نگاہوں کے آگے گھوم گئے ہیں۔

یہ کیا ہو گیا تھا؟ اسے لگا تھا وہ ہوش میں آ لئے گا تو چاہے اس کی یاداشت کھو بھی جائے مکمل صحت یاب ہونے کے بعد وہ اسے سب سچ بتا دے گی پھر چاہے وہ اس سے کتنی بھی نفرت کرے۔ جب وہ مکمل صحت یاب ہو کر اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائے گا تب لویزا بھی یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ لیکن سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں مجبور پھر سے ایک صریح غلطی کر بیٹھی تھی۔ اسے وہ

کہانیاں نہیں گھڑنی چاہیں تھیں جن کہانیوں کو رانا میر ہادی کے لاشعور نے کافی گہرائی سے ازبر کر کے سب کچھ مان لیا تھا۔ وہ ان کہانیوں کو سچ مان بیٹھا تھا۔ ان کہانیوں کو ہی اپنی حقیقت سمجھ چکا تھا۔ لویز کی آنکھیں تیزی سے نم ہوئیں وہ مسکرا دیا۔

یہ شکر کے آنسو ہوں گے۔

اس کا ردعمل میر ہادی کی سمجھ سے باہر تھا میر ہادی نے روز پانچ ماہ سے اس کے لبوں سے یہ تکرار سنی تھی۔

میر ہادی اٹھ جائیں۔

میر ہادی آنکھیں کھولیں۔

جیسے یوسفؑ کنوئیں سے نکلنے کے منتظر تھے میں بھی آپ کے ہوش میں آنے کا اتنی ہی شدت سے منتظر ہوں۔

میر ہادی میرا انتظار طوالت اختیار کر رہا ہے اب تو آنکھیں کھول دیں۔

آپ اٹھیں گے تو میں تمام عمر آپ کے قدموں کی خاک بن کر گزاروں گی۔

اور اب اس کی یہ بوکھلاہٹ میر ہادی کی سمجھ سے باہر تھی۔ فرطِ جذبات میں وہ ابھی تک اس کے سینے سے بھی نہیں لپٹی تھی۔

کیا ہوا وائفی،؟ سرپرائز دیا ناں، ایسے گم صم کیوں ہو" ادھر میرے پاس آؤ، ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں میں بلکل ٹھیک ہوں۔" رانا میر ہادی نے اس کی کلائی پر

نرمی سے دباؤ ڈالا تو وہ لرزتی کانپتی جھجھکتی اس کے پہلو میں بیٹھ کر بری طرح رو دی تھی۔

"آ، آپ کو ہوش کب آیا۔" اس سے کوئی بات نا بن پائی تو جھجھکتے ہوئے نمی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جب تم نے دوسرا سین سٹارٹ کیا تب ہی۔" وہ مسکرا کر جواب دے رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں،؟ ڈاکٹر کو بلانے دیں، مکمل چیک اپ ہو جائے گا تو تسلی ہو جائے گی۔" وہ

نگاہیں چراتے اسے بہلا رہی تھی۔ اعصاب جھنجھنا اٹھے تھے کچھ سمجھ نہیں آئی ہو کیا رہا ہے۔

نہیں اس کی بلکل ضرورت نہیں، بس تم پاس" بیٹھی رہو، مجھے محسوس کرنے دو کہ ہماری لائف جو پہلے اتنی بہترین گزر رہی تھی اب بھی وہ سنہرا دور واپس آنے والا ہے۔" رانا میر ہادی نے اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے اپنے دل کے مقام پر رکھا تو لویزا اقبال جی جان سے لرز گئی۔

"یہ آنسو صاف کرو، میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں ان سے۔"

میر ہادی نے محبت کی چاشنی میں ڈوبے لہجے میں کہا تو لویزا کی آنکھیں مزید ڈبڈبا گئیں۔ وہ خود پر مزید ضبط نا کر پائی اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میر ہادی نے آسودگی سے مسکرا کر اسے خود سے لگاتے آنکھیں موند لیں۔

میر ہادی کے کیئر ٹیکر اذان نے اقبال حمید کو کال ملائی تھی۔

"سر مسٹر میر ہادی کو ہوش آچکا ہے، میں نے ڈاکٹر

کو فون کر دیا ہے جلد آتا ہوگا، آگے کیا آرڈر ہے سر۔"

اذان کی اطلاع پر اقبال حمید چند لمحوں کو خاموش سے

ہو گئے۔

"ہوش میں آنے کے بعد اس کا کیا رد عمل تھا؟"

اقبال حمید نے بے تاثر لہجے میں پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے ان کی یاداشت پوری طرح چلی گئی ہے

اور وہ۔" اذان کہتے ہوئے جھجھک گیا۔

"وہ کیا؟" اقبال حمید کی سرسراتی آواز سن کر اذان نے تھوک نگلا۔

"مجھے لگتا ہے وہ میم کو اپنی بیوی سمجھ رہے ہیں۔" اذان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"واٹ ربش، کیا بکواس ہے؟" وہ بگڑ کر دھاڑے تھے۔ اذان نے اپنے کان سے فون پرے کیا۔

"سر یہی سچ ہے۔" اذان نے بے بسی سے کہا۔

میں اس شخص کو شوٹ کر دوں گا جس نے میری" بچی کی زندگی برباد کر رکھی ہے، کاش ایکسڈنٹ کے وقت ہی اسے جہنم واصل ہونے دیا ہوتا تو اب تک لیزا کو صبر آ جاتا۔" اقبال حمید نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے تھے لیکن یہ تو وہ ہی جانتے تھے کہ ایسا کچھ ہوتا تو لویزا اقبال بھی اس وقت زندہ نا ہوتی۔ اس کے دماغ پر گہری چوٹ آئی تھی ڈاکٹرز نے کہا تھا کوئی بھی صدمے کی بات لویزا کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ اور اس کی نازک جان لینے کو تو یہی بات کافی

ہوتی کہ رانا میر ہادی اب اس دنیا میں نہیں۔ سو اس وقت بھی لویزا کی زندگی میر ہادی کی زندگی سے مشروط تھی۔

"ٹھیک ہے، ڈاکٹر کے چیک اپ کے بعد مجھے رپورٹ کرنا۔" انھوں نے کہا اور فون رکھ دیا ۔ اقبال حمید نے اپنا دکھتا ماتھا بری طرح سہلایا۔ لویزا کی چیخیں آج تک ان کے کانوں میں گونجتی تھیں۔

"آپ نے وہ سب میر ہادی کے ساتھ کس سے پوچھ کر کیا تھا پاپا، آپ کو کس نے حق دیا تھا آپ یہ سب

کر کے میرے کردار کو اس کی نگاہوں میں سوالیہ
نشان بنا دیں۔ میں نے تو صبر کر لیا تھا ناں، آپ کی
بیٹی اتنی ہی گئی گزری تھی کہ آپ نے اسے اس
شخص کے سر پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کی جو
اسے پسند نہیں کرتا تھا کیوں؟ صرف اپنی طاقت کا
عملی مظاہرہ دکھانے کے لیے ؟ ایک باپ بن کر کیوں
نہیں سوچا آپ نے کہ اس طرح آپ کی بیٹی کی
نسوانیت کسی کی نظر میں دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے
گی۔ کیوں پاپا کیوں؟ مجھے ترکی کیوں نہیں جانے دیا

آپ نے۔ کیوں ہم سب کی زندگی برباد کر دی۔ میں ساری زندگی آپ سے بات نہیں کروں گی۔ اور اب اگر چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی زندہ رہے تو آپ مجھ سے اور میر ہادی سے ہمارے تمام معاملات سے بلکل دور رہیں گے۔ اب اگر آپ نے ہماری زندگی میں دخل انداز ہونے کی کوشش کی تو میں اسی وقت اپنی جان دے دوں گی۔ سمجھے آپ۔

اقبال حمید نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے کہ ہر طرح کی طاقت اور اختیار

آپ کی مٹھی میں ہونے کے باوجود آپ اس قدر بے بس ہوتے ہیں کہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ چیف صاحب اقبال حمید کے لیے بھی زندگی کا ایسا ہی دور چل رہا تھا کہ وہ یوں بے بس تھے کہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے انتظار کے یہ دیکھنے کہ یہ اونٹ اب کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

"مسٹر میر ہادی، آپ ماشااللہ بلکل صحت یاب ہو چکے ہیں، لیکن بیک بون اور لیفٹ سائیڈ ہپ بون پر لگنے

والی چوٹ کے باعث کچھ عرصہ تک آپ وہیل چیئر پر رہیں گے، اس میں بھی گھبرانے کے بلکل کوئی بات نہیں، صرف دو تین ماہ، اس سے زیادہ وقت بلکل بھی نہیں لگے گا، اس تھراپی کے لئے آپ کے ہوش میں آنے کا ویٹ کر رہے تھے ہم، میں آپ کو ماہر فزیو تھراپسٹ ہائر کروا کر دوں گا، جن کی تھراپی سے آپ بہت جلد ریکور کریں گے، ان شاءاللہ۔"

ڈاکٹر نے آ کر اس کا مکمل چیک کیا تھا اور پھر اسے صحت یاب ہونے کی خوشخبری کے بعد یہ بات کرتے کافی تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔

"میں بلکل پریشان نہیں ہوں، ان شاءاللہ جلد سب بہتر ہو جائے گا۔" میر ہادی نے کہا تو ڈاکٹر بھی مسکرا دیا۔

"جی ہاں انشاء اللہ، یہ میڈیسنز ہیں، آپ نے باقاعدگی سے لینی ہیں۔" ڈاکٹر نے دواؤں کا پرچہ اذان کی

جانب بڑھایا اور اسے کھانے پینے کے متعلق ضروری

ہدایات دے کر چلا گیا۔

ادھر لویزا نے سوچا تھا اس کی مکمل صحت یابی تک وہ

یہ ناٹک جاری رکھے گی۔ اور پھر اسے سب سچ بتا دے

گی۔ اسے اچانک کوئی بڑا صدمہ بھی تو نہیں دیا جا سکتا

تھا۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔

وہ کھانے کی میز پر بیٹھی بے صبری سے پاؤں جھلاتی اس کا انتظار کر رہی تھی جب آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا تو آنکھیں خوشگوار ترین احساس سے پھیل سی گئیں۔ لبوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ مچل اٹھی۔ آج ایک عرصے بعد وہ بلکل فریش نہا کر تازہ ہوئی شیو کے بعد گھنی مونچھوں کو سیٹ کیے رائل گرین ٹوپیس میں پہلے دن کی طرح بے تحاشا ہینڈسم اور ڈیشنگ شخص ٹھیک اس کے سامنے تھا۔ اذان اس کی وہیل

چیئر گھسیٹے لویزا تک لایا تو جو مسکراتے مبہوت سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اذان وہاں سے جا چکا تھا۔

اتنے عرصے بیمار رہنے کے بعد وہ تھوڑا کمزور ضرور ہوا تھا مگر قد و جسامت ہنوز اب بھی چٹانی تھے۔ باڈی سپرے ، شیونگ لوشن کی ملی جلی مہک نے لویزا کے حواس جیسے مختل کر ڈالے تھے۔ وہ اسے صحت یاب دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔

وہ اس کی خود پر اٹھتی ستائشی نگاہیں محسوس کر گہرا مسکرایا تھا۔

تو مطلب ہماری محنت وصول ہو گئی بیگم۔" وہ" خوشدلی سے بولا تو لویزا نے سٹپٹا کر نگاہیں پھیر لیں۔

آپ اور آپ کے اندازے۔" وہ اپنی بے اختیاری پر" جھینپ گئی تھی۔ فوری طور پر پیالے میں مٹن یخنی نکالی جو اس نے اسپیشل اس کے لیے بنوائی تھی۔

یہ لیجئے۔" وہ جو بغور اس کا گلابی پڑتا کتاب چہرہ دیکھ" رہا تھا لویزا نے آئیبرو کا اشارہ کرتے اسے کھانا شروع کرنے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ اس کی نگاہوں کی

تپش ہی ایسی تھی کہ وہ بھی ابھی ایک نوالہ تک نا لے پائی تھی۔

خود دیجئے۔" وہ اسی کی ٹون میں بولا تو لویزا نے آئبرو" اچکائی۔ "اپنے ہاتھوں سے پلائیں میڈم۔" وہ کافی ترنگ میں تھا۔ لویزا گہری سانس بھرتے اسے یخنی پلانے لگی۔ وہ یہ پیتے ہوئے بھی مسلسل اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔ جس سے لویزا بری طرح کنفیوز ہوئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے لویزا نے اسے یخنی پلا کر خود کھانا کھایا تھا۔ لویزا نے اٹھ کر برتن

سمیٹے اور اذان اسے واپس اس کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ واپسی پر اذان اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ بیالیس سالہ ادھیڑ عمر شخص تھا جو ان کا خاندانی وفادار ملازم تھا۔

میم، آپ کو سر بلا رہے ہیں۔" اذان کے کہنے پر" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تمام ضروری کام نمٹا کر وہ سر پر سکارف لیے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

آپ ابھی تک سوئے نہیں، آپ نے میڈیسن لی ہے"
آرام کریں۔" اس نے نرمی سے کہا تھا مگر میر ہادی
اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

"میری کڑوی ایلوویرا، شاید آپ ایک ہی دن میں یہ
بات بھول گئی ہیں کہ مجھے اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے
ہر وقت آپ کی یہ سریلی آواز سننے کی عادت ہو گئی
ہے اسی لیے دن کے تینوں وقتوں کی روٹین میں کوئی
ردو بدل نہیں ہوگی، شرافت سے یہاں بیٹھیں اور ناول
کا باب وہیں سے شروع کریں جہاں سے کل ادھورا

چھوڑا تھا۔" وہ چمک کر بولا تھا۔ اس کے طرزِ تخاطب پر لویزا کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ بھاگنے کی کونسی توجہی پیش کرتی سو شرافت سے کتاب اٹھا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

ہائے اللہ، آپ کی یہ فرمانبرداری۔" وہ بیڈ کراؤن سے" ٹیک لگائے مسکراتے بولا تھا۔ تب لویزا بھی مسکرا دی اور ناول وہیں سے شروع کر دیا۔ وہ بغور سن رہا تھا اور

اس کے ملتے گلاب کی پنکھڑیوں سے گلابی لب دیکھے جا رہا تھا۔

لیزا۔" میر ہادی نے نرمی سے پکارا تو لویزا بری طرح" چونکی۔ ٹھٹھک کر اس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

مجھے کچھ یاد نہیں، مجھے بتاؤ ہم کیسے ملے تھے،؟" میری فیملی، تمھاری فیملی سب کہاں ہیں؟ ہم یہاں اکیلے کیوں ہیں؟ ہماری شادی کب، کہاں اور کیسے ہوئی تھی؟ وہ پوچھ رہا تھا اور لویزا کا چہرہ پھیکا پڑتا گیا۔

وہ جانتی تھی یہ وقت ضرور آئے گا۔ لیکن اتنی جلدی)
آئے گا اسے اندازہ نا ہوا۔ ہاں مگر اس کی تیاری پہلے
سے کر رکھی تھی۔ ایک جھوٹا سکرپٹ بہت اچھے سے رٹا
ہوا تھا۔ لیکن تھا تو 'جھوٹا' ہی۔ وہ جانتی تھی جسے اتنا
رٹنے کے بعد بھی اس کی زبان لڑکھڑا جائے گی۔(

"آپ کا تعلق ملتان کے فیوڈل گھرانے سے ہے۔ اور
مرے پاپا بزنس مین ہیں۔ہم یونیورسٹی میں ملے تھے
پھر ہمیں پیار ہو گیا، آپ کے خاندان میں خاندان سے
باہر شادی نہیں کرتے تھے، اسی لیے آپ نے اپنی

پوری فیملی کو میری خاطر چھوڑ دیا، میرے پاپا بھی ہماری شادی کے خلاف تھے تو میں انھیں آپ کی خاطر چھوڑ دیا۔ ہم نے چھپ کر نکاح کیا تھا" اس نے بہت بے سکونی سے ایک من گھڑت کہانی سنائی مگر اس کے اگلے سب سے ویلڈ سوال پر لویزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

اگر ہم دونوں یونیورسٹی گوئنگ سٹوڈنٹس نے اپنی اپنی" فیملی کو چھوڑ دیا تھا تو یہ اتنا لگژری اپارٹمنٹ کس کا ہے؟ ہم یہاں کیوں اور کیسے رہ رہے ہیں، یہ پیسہ

کہاں سے آ رہا ہے۔" میر ہادی کے لہجے میں الجھن تھی جبکہ لویزا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حساب تھا۔

"میری ماما، چند سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا، انھیں وراثت میں ملی کروڑوں کی پراپرٹی ان کی اکلوتی بیٹی یعنی میرے نام ہے تو آپ اس متعلق کیوں اتنی فکر کر رہے ہیں، زیادہ پریشان مت ہوں سب ہمارا ہے۔"

لویزا نے ہموار سے لہجے میں کہا لیکن رانا میر ہادی کے چہرے پر تفکر و پریشانی کی لکیریں تھیں۔

فکر کیوں نہیں کروں لیزا، یہ سب تمھارا ہے، تمھاری"
جمع پونجی جو تم مجھ پر لٹا رہی ہو، جبکہ تمھارا نان نفقہ اور
زمہ داری پوری طرح میرا فرض ہے، پتہ نہیں میں کب
"اس قابل۔

خدا کے لیے بس کریں۔" وہ جھنجھلا گئی۔ (اف"
خدایا، یاداشت چلی گئی لیکن روایتی فیوڈل لارڈ صاحب
کی مردانگی ہنوز جوش مار رہی ہے جو یہ برداشت نہیں کر
سکتی کہ عورت حاکم اور با اختیار ہو کر سرفراز کی
(کرے اور وہ مرد ہو کر اس کے زیر اثر رہے

"میرا سب کچھ آپ کا ہی ہے اسی لئے آپ۔"

اور تم کس کی ہو؟" میر ہادی نے اس کی بات

کاٹ دی آنکھوں میں ایک خاص چمک لیے اس کے

صبیح چہرے کو بغور دیکھا۔ لویزا اس کے انداز و اطوار

سے سٹپٹا گئی۔

مم ہ،میں بھی صرف آپ کی ہوں۔" کہتے زبان لڑکھڑا"

سی گئی۔ وہ جسے شرم و حیا سے معمور کر گیا۔

تو پھر یہ صبح کو ہی اس کمرے سے ہاسپٹل بیڈ ہٹوا کر ہمارا بیڈ یہاں سیٹ کرواؤ، کیونکہ اب میں تمھارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔" رانا میر ہادی نے انتہائی ذو معنی الفاظ میں کہتے لویزا اقبال کے اوسان خطا کیے تھے۔

"غیر ضروری باتیں مت کیجئے آپ، ابھی کچھ عرصہ اور آپ کو انتہائی نگہداشت میں رکھنا ہے، آپ کی صحت کا بے تحاشا خیال رکھنا ہے ہم نے، اسی لیے کچھ بھی

فضول سوچے بغیر بس آپ اپنی صحت پر توجہ دیں۔" وہ تڑخ کر بولی تھی لیکن وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔

"یار میں کوئی نیو بورن ہوں جسے انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہے؟ وہ جھنجھلایا تب اسے گہری وارفتگی لیے دیکھا" یہ میں طے کروں گا اب آگے مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی۔" خمار آلود سا لہجہ تھا وہ پھر پٹڑی سے اتر گیا تب لویزا کو سمجھ آئی وہ اصل معنوں میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ بات کہاں سے

کہاں جا پہنچی۔ لیکن اس سب میں اسے یہ ضرور تسلی ہوئی تھی کہ وہ اس کی باتوں پر یقین کر چکا تھا۔

آرام کریں آپ، سو جائیں، باقی سٹوری صبح۔" وہ آخر" عاجز آ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اس شرط پر سونے لگا ہوں کہ صبح میری بات پر" عمل درآمد ہو جانا چاہیے۔" وہ کہتا منہ بناتے بستر پر لیٹ گیا۔۔ لویزا نے مسکرا اس پر کمبل درست کیا۔ لائٹ آف کی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ فزیو تھراپسٹ سے تھراپی کروا کر وہیل چیئر خود ہی گھسیٹے لاؤنج میں آیا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے کہے کے مطابق بہت جلد ریکور کر رہا تھا۔ اب بس پنڈلیوں سے نیچے پاؤں تھے جن پر وزن ڈالنے سے ہپ اور بیک بون میں کافی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا وہ جلد از اسے بھی رکور کر لے۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا اسے ہوش میں آئے اور ان ڈیڑھ ماہ میں اس نے اس نازک کومل پھول سی لڑکی کو بڑے مکینکی اور مشینی انداز میں دن

رات اپنی خدمت میں جتے پایا تھا۔ وہ اس کی صحت کے معاملے میں اس سے بھی زیادہ ٹچی تھی یوں کہ ابھی تک میر ہادی کے کمرے سے وہ ہاسپٹل بیڈ نہیں نکالا گیا تھا۔ وہ اپنی ذات بھلائے اس کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں مصروف رہتی اور اس بات نے رانا میر ہادی کو جیسے خرید ہی لیا تھا۔ وہ دل و جاں سے اس پر فدا اس کی محبت میں ایسے گرفتار ہوا کہ اب تو وہ سانسوں میں بھی یوں بس گئی تھی کہ چاہتا بھی تو اسے خود سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اس کے عشق نے

رانا میر ہادی کی روح میں اپنا بسیرا کیا تھا۔ سو اس سے
ایک پل کی بھی دوری وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا اور وہ ملازمہ کے سر پر کھڑی کھانا لگوا
رہی تھی۔

"آپ کے لیے وائٹ ساس پاستہ بنایا ہے میں نے،
اور بتا دیں آپ کیا کھانا پسند کریں گے۔" وہ مصروف
سے انداز میں بولی۔

اس ڈش کا نام ہے مسز ایلوویرا میر ہادی۔" اس" نے بہت دھیمے سے کہتے اس کے چھکے چھڑائے تھے۔

لویزا نے سٹپٹا کر پہلے ملازمہ اور پھر اس کے مسکراتے معنی خیزی لیے چہرے کی جانب گھور کر دیکھا۔ لیکن اس کی نگاہوں کی لپک ہی ایسی تھی کہ وہ زیادہ دیر اس کی جانب دیکھ ہی نہیں پائی۔

چپ چاپ کھانا کھا لیں۔" لویزا نے دانت پیس کر" کہا تو اس نے ایک سرد آہ بھری۔

ظالم لڑکی، دنیا کی کوئی بیوی اتنی ظالم نہیں ہوگی جتنی" تم ہو، کسی سٹرک ٹیچر کی طرح، بس ڈسپلن، رولز اینڈ ریگولیشن۔" وہ چڑ کر بولا تو لویزا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ بڑی میٹھی سی ہنسی کی جلترنگ تھی جو وہ مبہوت سا دیکھے گیا۔ لویزا اس ساحری کے سحر سے نکلنے کو جلدی سے جا کر کچن میں گھس گئی۔ میر ہادی ایک ایک سرد سی سانس اپنے اندر کھینچتے اپنے لیے کھانا نکالنے لگا۔

آج دن میں کافی مصروفیت ہونے کی وجہ سے وہ نہا نہیں پائی تھی۔ گھر کی تھوڑی سیٹنگ چینج کروائی تھی اور رانا میرا ہادی کا بیڈ روم تقریباً پورا کا پورا ہی بدلا تھا۔ کیونکہ کمرے سے ہاسپٹل بیڈ نکال کر لکڑی کا فل سائز بیڈ لگوایا تھا۔

وہ کافی تھک چکی تھی تبھی اب فریش سی آئینے کے سامنے کھڑے سی گرین ٹراوزر کے اوپر شارٹ فراک پہنے وہ ہم رنگ دوپٹہ میں نم بال کمر پر بکھرائے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر موئسچرائز لوشن لگا رہی تھی۔ ادھر

میر ہادی نے آوازیں دے دے کر اور جان بوجھ کر چمچ سے ٹیبل، بیڈ اور جگ بجا بجا کر شور مچاتے اس کے ہاتھ پیر پھلا دیئے تھے وہ غالباً اسے آوازیں دے رہا تھا۔ لویزا جھنجھلائی اس کا ارادہ تھا بال ہیر ڈرائر سے سکھا کر ہمیشہ کی طرح جوڑے یا کیچر میں مقید کر کے ادھر جائے گی۔ مگر رانا میر ہادی نے خود ہی اتنا مچا رکھا تھا کہ ہر چیز بھاڑ میں جھونک کر وہ اس کے کمرے کی جانب بھاگی۔

کمال ہے بھئی، آپ نے تو میرے ہاتھ پیر ہی پھلا" دیئے تھے۔ وہ کمرے میں آ کر نروٹھے پن سے بولی جبکہ رانا میر ہادی اسے دیکھ سانس تک لینا بھول گیا تھا۔

وہ سرخ و سفید نازک کانچ سی گڑیا سانچے میں ڈھلے نرم و ملائم وجود کے ساتھ رعنائی اور دلربائی کا مکمل پیکر تھی اور صرف اس کی تھی۔ کچھ بھینی بھینی خوشبو سے معطر نم زلفیں کمر پر بکھری الگ ہی قیامت خیز سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ رانا میر ہادی کے حلق

میں کانٹے سے اگ آئے۔ دل مچل گیا۔ نوخیز سے جذبوں کی مہک سینے میں انتہائی عروج پر پہنچی تو رانا میر ہادی کا انگ انگ بھٹی کی مانند تپنے لگا۔ وہ ناول لے کر بیڈ کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھنے لگی جب میر ہادی نے ذرا سا پیچھے سرک کر بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

یہاں آکر بیٹھو لیزا۔" جذبات سے بھرپور بھاری" بوجھل سے لہجے میں اس نے اپنے پہلو کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے کہا تو لویزا کو زمین آسمان اپنی نگاہوں کے آگے گھومتے دکھائی دیئے۔

"میں ٹھیک۔"

لیزا یہاں آؤ۔" اب کی بار اس نے اس کی بات" کاٹ دی تو لویزا جھجھکتے اس کے پاس آئی۔ اس سے پہلے وہ وہاں ٹک کر بیٹھتی بہت اچانک میر ہادی نے اس کی کلائی سے تھام کر ایک ہلکا جھٹکا دیا تو وہ کٹی ڈال کی طرح لہرا کر اس کے کشادہ سینے پر آن پڑی۔ لویزا نے جھنجھناتے اعصاب لیے بوکھلا کر اس کے

سینے پر ہاتھ جماتے اس کے اور اپنے بیچ ایک حد بندی قائم کی۔ لویزا کے ڈارک براؤن گھنے لمبے بال کچھ میر ہادی کے سینے پر کچھ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔

مم، میر ہادی آپ۔" وہ گھگھیا گئی بات بھی مکمل نا" ہوئی۔

کیا ہوا؟ کچھ غلط تو نہیں، کہتے میر ہادی نے اس" کے چہرے سے اس کے بال پیچھے کرتے اس کے کان میں اڑسے اور اپنے کھردرے ہاتھ کی انگلیوں کی

پشت سے اس کے سرخ کشمیری سیب سے گال کی نازکی و ملائمت اپنی روح میں سرایت کرتی محسوس کی۔

"میرا ہادی آپ۔"

میں بلکل ٹھیک ہوں لیزا، بس اس وقت صرف" تمھیں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے میر ہادی نے محبت کی پہلی مہر اس کے ماتھے پر ثبت کی تو لویزا کو لگا وہ مر جائے گی۔ وہ اس صورت حال سے بری طرح سہم گئی تھی۔ کیونکہ اب میر ہادی نے ایک بازو اس کی نازک کمر کے گرد مضبوطی سے حمائل کر لیا اور

گہری دلچسپی سے اس کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھنے لگا۔ میر ہادی نے اپنے لب اس کی گال پر رکھے یوں کہ لویزا کو اس کے سلگتے لمس کی تاثیر جلد کے اندر تک اترتی محسوس ہوئی۔ اس کی اس قدر شدت اور ایسی دہکتی قربت اس کے حواس چھین رہی تھی لویزا کو لگا وہ اپنے ہوش گنوا دے گی۔ میرا ہادی کے لیے یہ سب جائز، حلال اور بہت خوبصورت تھا۔ اس کے لیے سکون حاصل کرنے کا باعث تھا۔ اس کی بہکتی مچلتی وارفتہ نگاہیں اس کے پورے وجود کا احاطہ کرنے لگیں۔ اس

کی آنکھوں میں ایک صاف پیغام لکھا تھا وہ آج کیا چاہتا ہے۔

لیکن لویزا کو اس کی یہ قربت بچھو کی طرح ڈنک مارتی محسوس ہوئی تو وہ تڑپ کر ہانپتی ہوئی اس کی گرفت سے چکنی مٹی کی طرح پھسل گئی۔

مم،میر ہادی آپ ٹھیک نہیں تت،تو۔" وہ بول رہی" تھی اور اس نے آج واضح طور پر رانا میر ہادی کے ماتھے پر بلوں کا جال بچھا محسوس کیا تھا۔

یہ تم نہیں میں طے کروں گا کہ میں اب ٹھیک" ہوں یا نہیں، کسی قابل ہوں یا نہیں۔" میر ہادی نے بے تاثر لہجے میں کہتے اس کی سٹی گم کر دی۔

"واٹس رونگ ود یو لیزا، کیا ہوا ہے یہ گریز کیوں؟" اس نے پھر بھی نرمی سے پوچھا تھا۔ وہ پاس کھڑی دوپٹہ اپنے سر پر جماتی اپنے ہاتھ بری طرح مروڑنے لگی۔

"وہ بس میری طبیعت ٹھیک نہیں آج بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔" اور کچھ تو نہیں اسے لیٹ آٹائم یہی بہانہ سوجھا تھا سو جلدی سے بول بھی دیا۔

"اوکے ٹھیک ہے آج ناول رہنے دیتے ہیں تم آرام کرو۔" میر ہادی کا لہجہ پوری طرح نرم پڑ گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر جانے لگی جب وہ بری طرح جھنجھلایا۔

"لیزا، یہاں میرے پاس آ کر لیٹو۔" اس کی اگلی فرمائش پر لویزا کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

آپ کی ہڈی پسلی ابھی جڑی کب ہے؟ آپ کو یاد"
ہو تو میں بہت زیادہ ٹانگیں مارتی ہوں سوتے وقت، اسی
لیے ابھی احتیاط اچھی۔" وہ کندھے اچکا کر ہنستے
ہوئے بولی۔ تو وہ بھی ہنس دیا۔

میں خود ہی قابو کر لوں گا تم آؤ تو سہی۔" اس کی"
بات پر وہ سٹپٹائی چہرہ بھانپ چھوڑنے لگا۔

حد کرتے ہیں آپ، سو جائیں آرام سے، وہ کہتی جان"
بوجھ کر اپنی پچھلی گردن سہلانے لگی۔

جاو جا کر آرام کرو لیزا۔" وہ محبت بھرے لہجے میں" بولا تو لویزا سر ہلاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میر ہادی نے گہرے سانس بھرتے اپنے مچلتے جذبات پر بند باندھا اور سختی سے آنکھیں موند لیں۔

عالی بھائی، کچھ پتہ چلا ہادی بھائی کا؟" رانا شامیر" زریاب نے بیقراری سے علی سے پوچھا تو اس نے مایوسی بھرے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ شامیر تک ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

تقریباً آٹھ ماہ سے وہ اور ان کا پورا خاندان اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اس کی شادی ٹوٹنے کے بعد بس اتنا پتہ ہے کہ وہ یونیورسٹی کسی سے ملنے گیا تھا۔ کیوں اور کس سے ملنے گیا تھا کسی کو کچھ خبر نا تھی اور تقریباً یونیورسٹی کے سی سی ٹی وی فوٹیج کے مطابق پوں گھنٹے میں یونیورسٹی سے نکل بھی گیا تھا۔ اس کے بعد رانا میر ہادی کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان کسی کو کچھ خبر نا تھی۔ ماں باپ تو حیات نہیں تھے البتہ تایا چاچوؤں نے رانا میر ہادی سے بڑے بھائی جو کہ شادی کے بعد

الگ لاہور میں مقیم تھے انھوں نے سب نے مل کر

پورے پنجاب کی خاک چھان لیں تھی لیکن میرا ہادی

کا کچھ اتا پتہ نہیں تھا۔ حویلی، گھر کاروبار کا تمام بوجھ

شامیر کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا۔ امپورٹ ایکسپورٹ

کی پوری کمپنی تھی جو رانا میر ہادی پڑھائی کے باجود

سنبھالے ہوا تھا۔ اب شامیر کی سختی آگئی تھی وہ

ساتھ ساتھ اسے دن رات دن

ڈھونڈتا تھا ساتھ ساتھ آفس سنبھال رہا تھا۔ ایسے میں

اگر اسے عالی بھائی کا مضبوط اور برابر کا سہارا نا ملتا تو

وہ تو کب کا ہار مان لیتا۔ انھوں نے اب بھی اس کی تلاش نہیں چھوڑی تھی۔ پولیس بھی اسے ڈھونڈنے میں بری طرح ناکام رہی تھی۔

اگلی صبح سیاہ شلوار قمیض میں وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو وہ حسب معمول ٹی پنک ٹراؤزر ٹی شرٹ میں سکارف گلے میں ڈالے بالوں کا جوڑا بنائے اپنے رف سے حلیے میں بھی بہت زیادہ دلکش اور حسین تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔

آپ ناراض تو نہیں مجھ سے۔" اس نے نگاہیں جھکا"
کر اس سے پوچھا تو وہ گہرا مسکرا دیا۔

بلکل نہیں، میری خواہش تمھاری تھکاوٹ سے زیادہ"
اہم نہیں تھی، کل تم نے کام بھی تو بہت زیادہ کیا
تھا۔" وہ اس کی فکر میں گھلتا تھا لویزا کو یہ بات روح
تک سرشار کر دیتی تھی۔ لویزا نے اس کے لئے ناشتہ
ٹیبل پر چن دیا۔

اپنے ہاتھوں سے کروائیں محترمہ۔"آج اس نے"
کافی دنوں بعد فرمائش کی تھی سو وہ مسکراتے ہوئے

اپنے ہاتھوں سے اسے ناشتہ کروانے لگی۔ آج میر ہادی نے بھی چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالے تھے۔ یہ وہی لمحہ تھا جب اس کا فون پھر سے چنگھاڑنے لگا تو لویزا کے ماتھے پر بلوں کا جال بچھ گیا۔

یہ فون صبح سے یونہی بج رہا تھا۔ اور لویزا اسے نظر انداز کر رہی تھی ۔ میر ہادی اچھے سے نوٹ کر رہا تھا۔

کس کی کال ہے، فون کیوں نہیں اٹھا رہیں۔" میر" ہادی کو مسلسل بجتے فون سے تشویش لاحق ہوئی۔

میرے پاپا کا ہے، لیکن میں بات نہیں کرنا"

چاہتی۔" لویزا نے کہتے بیقراری کے عالم میں اپنے ہاتھ

بری طرح مروڑے۔

اور تم بات صرف اس لئے نہیں کرنا چاہتی کہ کہیں"

وہ تمھیں مجھے چھوڑنے کا ناں بول دیں۔" وہ مسکراتے

ہوئے بلکل سہی نتیجے پر پہنچا تو لویزا دم بخود سی ہو گئی۔

میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں لویزا میر ہادی کے"

تمھارے دل کی بات تمھارے چہرے سے پڑھ سکتا

ہوں۔" میر ہادی نے اطمینان سے کہتے اظہار کیا تو لویزا

کا دل کانوں میں بجنے لگا۔ "کر لو اپنے بابا سے بات، میں اذان کے ساتھ باہر پارک کا چکر لگانے جا رہا ہوں، اگر انھوں نے تمھیں مجھے چھوڑنے کا بول بھی دیا تو کون سا تم نے مجھے چھوڑ ہی دینا ہے لیزے، سو ریلیکس، ایزی ہو کر بات کرو۔" اس کے لہجے مان تھا پختہ یقین اور چاہے جانے کا غرور۔ تبھی وہ کہتے اذان کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ لویزا سرد سانس کھینچتے اپنے کمرے میں آئی اور مسلسل بجتا فون آن کر کے اپنے کان سے لگایا۔

اسلام و علیکم پاپا۔" بڑا لٹھ مار سا انداز تھا۔"

وعلیکم السلام،آخر کب تک مجھے یہ تماشہ اور اپنی بیٹی"
کو برباد ہوتے چپ چاپ دیکھنا ہے، یہ آدمی بلکل
"ٹھیک ہو گیا ہے تو کب اپنے گھر واپس جا رہا ہے؟

اقبال حمید کی سرد و سپاٹ آواز فون سے گونجی تو لویزا
نے اپنا ماتھا بری طرح مسلا۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے اور رانا میر ہادی"
کے تمام معاملات سے دور رہیں۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔

مگر ان کی اگلی بات پر بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"بہت خوب، اور میں دنیا کا سب سے بیغیرت باپ بن جاؤں جو اپنی بیٹی کو ایک نا محرم کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے چپ چاپ رہتے دیکھتا رہوں۔" وہ بھڑک اٹھے تھے لویزا نے بری طرح اپنے لب کاٹے۔

"میرا اور اس کا رشتہ محض ایک بیمار مریض اور ایک کیئر ٹیکر کا ہے پاپا۔" وہ یہ وضاحت دیتی خود بخود ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

"یہ طفل تسلیاں کم از کم مجھے مت دو لیزے، وہ ذہنی مریض آدمی یاداشت کھونے کے بعد تمھیں اپنی

بیوی سمجھتا ہے، اس کو میں کیا سمجھوں؟" وہ سلگ کر بولے تھے۔

وہ ٹھیک ہے اب، میں آج ہی اسے ساری سچائی بتا" دوں گی پاپا، کل تک کا وقت دے دیں۔" لویزا نے آنکھیں زور سے بند کرتے پسپائی اختیار کی تھی آخر ایک نا ایک دن تو یہ وقت آنا ہی تھا تو ابھی کیوں نہیں۔ وہ مزید اپنے باپ کو شرمندہ نہیں کر سکتی تھی نا ہی اپنی محبت کے چکر میں اپنی نسوانیت پوری طرح داؤ پر لگا سکتی تھی۔

ویری گڈ۔اب اس بات پر عمل ہو جانا چاہیے، میں" کل کو تمھیں واپس لینے آ رہا ہوں، کل کے بعد میں کچھ بھی نہیں سنوں گا لیزا، یو گیٹ دیٹ؟" انھوں نے کہتے فون رکھ دیا تھا۔

لویزا نے اپنی کنپٹیاں سہلائیں۔اسے یہ فیصلہ لینا ہی تھا۔ ویسے بھی اب وہ بھی دن بدن بڑھتے اس کے شوخ تقاضوں سے پریشان ہونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کچھ انہونی ہو جاتی اسے پھر سے اس سے ہر حال میں ہر قیمت پر دور جانا تھا۔

"یہ دن کافی بوجھل تھا۔ رانا میر ہادی اسے اپنے پاس بلاتا رہا مگر وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ میر ہادی نے ڈنر بھی اکیلے کیا تھا۔ اس نے بول دیا اس کی طبیعت خراب ہے۔ یہ فیصلہ لینا آسان نہیں تھا۔ لیکن اس کا سامنا اسے ہر قیمت پر کرنا تھا۔ سو وہ سیاہ ٹراوزر فراک میں دوپٹہ سر پر درست کرتی اب مردہ قدموں سے چلتی اس کے کمرے تک آئی تھی۔ وہ دروازے پر دستک دیتی اندر آئی تو آج وہ بیڈ پر نہیں کمرے میں

دیوار کے پاس رکھے صوفے پر ناول ہاتھوں میں لیے بیٹھا جیسے اس کا شدت سے منتظر تھا۔ وہ ہاتھ مروڑتی اس کے پاس ایک قدم کے فاصلے پر آن رکی۔

"میر ہادی، مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ بڑی دقت سے بول پائی لیکن اگلے ہی لمحے میر ہادی نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی جانب کھینچا تو وہ ہلکی چیخ کے ساتھ اس کے گلے کا ہار بن گئی وہ اس کی آغوش میں آن رہی تو بری طرح مچل گئی۔ لیکن میر

ہادی نے اس کی کمر کے گرد مضبوطی سے اپنی بانہیں حمائل کر لیں۔

لیکن آج میں کچھ نہیں سننا چاہتا کچھ بھی نہیں" لیزا، آج صرف خاموشی بولے گی دھڑکنیں شور مچائیں گی یا ہمارے دل محبت کی زباں بولیں گے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" کہتے اس نے اس کی گردن میں اپنا چہرہ چھپایا تھا۔ لویزا کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا اس کی قربت کی تپش سے اسے اپنا جسم ہی نہیں

روح تک جھلستی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کیا کرنے آئی تھی اور یہاں ہو کیا رہا تھا۔

میر ہادی پلیز ایسا مت کریں۔" اس نے بری طرح تڑپتے اس کے کندھوں پر ہاتھ جما کر دونوں کے بیچ فاصلہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

آج انکار کی تکرار بے معنی ہے یہ ابھی کچھ دیر میں تم اچھے سے سمجھ جاؤ گی۔" وہ پوری طرح بہک گیا تھا۔ جذبوں کا گھوڑا سرپٹ دوڑتا بے لگام ہو گیا۔ اس

کے ضبط کا باندھ آج ٹوٹ گیا تھا تبھی اسے ہر حال میں وہ حاصل کرنے کی ٹھان بیٹھا تھا۔

لویزا نے اسے خود سے دور کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوئی تھی وہ اس کے جارحانہ حصار میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ لیکن جب گردن کو چھوتے اس کے دہکتے لب اپنی حدود پار کرنے لگے تو وہ تڑپ اٹھی۔ تب اپنی پوری طاقت صرف کرتے وہ اس کے حصار سے نکل گئی تھی۔

سارا فسوں ایک پل میں چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ آج اپنی اس حرکت پر رانا میر ہادی کے لال بھبھوکا چہرے پر غیض و غضب کی سلگتی بھڑکتی آگ وہ بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے لویزا، کس طرح کا گریز ہے آخر؟ تمہارے اس رویے کو میں کیا سمجھوں؟“ وہ غضبناک ہوتا غرا اٹھا تھا۔

”آپ ٹھیک۔“

او شٹ اپ لویزا میر ہادی، کان پک گئے ہیں میرے یہ بات سن سن کر، میں نے پہلے بھی تمھیں کہا تھا یہ تم نہیں میں طے کروں گا میں ٹھیک ہوں بھی یا نہیں، تم اپنی بتاؤ اس رویے کو میں کیا سمجھوں آخر؟ تنگ آ گئی ہو مجھ سے اکتا گئی ہو؟" وہ آج کوئی لحاظ نہیں کر رہا تھا تبھی بھڑک اٹھا۔ لویزا کی آنکھیں غم و غصّے کی شدت سے تیزی سے بھیگ گئیں۔

آپ غلط سمجھ رہے میر ہادی ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

تو اور کیسا ہے؟ میں ہی پاگل ہوں جو اپنی ٹوٹی پھوٹی"
معذور حالت نہیں دیکھ رہا، اور چلا ہو آسمان سے چاند کو
چھونے، وہ اپنی ناتمام خواہش کی وجہ سے بے تحاشا
اذیت اور خود ترسی کا شکار ہونے لگا۔ لویزا تڑپ اٹھی۔
آنسو ٹوٹ کر گال بھگونے لگے۔ وہ اس وقت خود سرخ
آنکھوں میں نمی لئے اپنے منہ سے آگ اگل رہا تھا۔

"میر ہادی ایسا بلکل نہیں۔"

ڈاکٹرز تو جھوٹی امید دلاتے ہی ہیں، میں نے جانے"
اپنے پیروں پر کھڑے ہونا بھی ہے کے نہیں، اپنے

معذور شوہر کو خود کے قابل نہیں سمجھتی ناں تم۔" وہ چیخ پڑا اور لویزا کو لگا اس نے اپنے الفاظ سے اس کی وفا اور محبت کے منہ پر تمانچہ رسید کر دیا تھا وہ بلبلا اٹھی۔

آپ پاگل ہو گئے ہیں میر ہادی؟ ایسا کچھ نہیں" ہے؟ ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کی فکر اور ،خدمت گزاریوں میں اپنی ذات نا بھلائے بیٹھی ہوتی میری صرف آپ کے لیے وفا شعاری اور اتنے دنوں کی خدمت گزاری آپ کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی؟" وہ چیخ پڑی۔

اگر مجھے بھوک لگی ہے لیزے تو تمھارے مجھے دیئے "
گئے سونے کے بسکٹ بھی میرے کسی کام کے
نہیں، اسی طرح تمھاری خدمت گزاری میرے کسی
کام کی نہیں اگر تم مجھے اپنے قابل ہی نہیں
سمجھتیں۔" وہ بھرائی آواز میں غراتے بری طرح اپنے
لب بھینچ گیا تھا۔

لویزا نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی تڑپتی درد میں
ڈوبی حالت۔ لویزا اقبال کے خود کے دل کی دگرگوں
حالت۔ یہ بات تو طے تھی وہ اسے کسی صورت کسی

قیمت پر چھوڑ نہیں سکتی۔ نا اس کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ وہ بہت جلد ایک فیصلہ کن نتیجے تک پہنچی تھی۔

"ٹھیک ہے آپ اپنی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں لیکن ذرا مجھے یہ تو بتائیں آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ میرے شوہر ہیں۔" لویزا نے بلکل سرد و سپاٹ لہجے میں کہتے میر ہادی کے چودہ طبق روشن کر دیئے وہ بھونچکا سا اسے دیکھے گیا۔

"یہ کیا بات کر رہی ہو لویزا ہوش میں تو ہو، تم میری بیوی ہو اور میں تمھارا شوہر ہوں۔" وہ اس نئے الزام پر

بلبلایا تبھی چلا اٹھا تھا۔ اس لڑکی کی ذرا سی دوری ذرا سی بے رخی اس کی روح کو تڑپانے کے لیے کافی تھی کجا کے اتنا بڑا الزام کہ وہ سرے سے اس کی کچھ لگتی ہی نہیں۔ میر ہادی کو لگا صدمے سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

تو لائیں، دکھائیں کوئی ثبوت؟ کیسے ثابت کر سکتے ہیں آپ کی میں آپ کی بیوی ہوں، کل کو ہمارے ملن کا جو نتیجہ نکلے گا اس کو جائز ثابت کرنے کا کیا ثبوت دکھائیں گے آپ لوگوں کو۔" وہ کافی بے رحمی

اور بے دردی سے بولی تھی۔ میر ہادی پھٹی پھٹی خون چھلکاتی نگاہیں لیے اسے دیکھے گیا۔

"لیزے یہ ہولناک قسم کی پہیلیاں بجھوا کر مجھے یوں اذیت مت دو کہ میری جان نکل جائے، صاف صاف بتاؤ آخر بات کیا ہے، کس طرح کے ثبوت؟ کہنا کیا چاہتی ہو؟" وہ سلگ اٹھا۔

"ہمارا نکاح رجسٹرڈ نہیں ہوا تھا، ہم نے مسجد میں نکاح کیا تھا، ایکسڈنٹ کے وقت گاڑی میں آگ لگی اور نکاح نامہ اور تمام ضروری ڈاکومنٹس جل کر راکھ ہو گئے، اب

ہمارے پاس کوئی پروف نہیں ہے رانا میر ہادی کہ ہم دونوں ہزبینڈ وائف ہیں۔" آج پھر لویزا اقبال نے اس شخص کو، اپنی محبت کو پانے کو بڑی دقتوں سے ہی سہی مگر فراٹے سے جھوٹ بول دیا تھا۔مگر یہ جھوٹ بولتے وہ بری طرح رو پڑی تھی۔ اس کی بات سن کر میر ہادی اپنی جگہ پر پتھر کی مورت بن گیا۔ وہ گم صم سا تھا پھر اپنا ماتھا بری طرح مسلا۔

تو تم اسی لئے اتنے دنوں سے نکاح نامے کو لے کر" ان فضول کے تحفظات کا شکار ہو، مجھ سے پہلے ایک

"بار ہی سہی شئیر تو کیا ہوتا لیزا ہم دوبارا نکاح کر لیتے۔

میر ہادی کا لہجہ خود بخود نرم اور دھیما پڑ گیا۔ مگر وہ رولئے گئی۔

لیزا میری جان، ادھر آؤ، میر ہادی نے اسے محبت" سے بھرپور لہجے میں اپنے پاس بلایا تو وہ مزید ٹوٹ کر بکھر سی گئی۔ تب میر ہادی نے اپنی پوری طاقت لگا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دائیں پیر پر پورا وزن نا ڈال سکتا جب بری طرح لڑکھڑایا تو لویزا نے بوکھلا کر لپک کر اسے تھام لیا وہ اس کے دائیں بازو کو اپنی

گردن میں ڈالے اسے سہارا دے گئی۔ وہ نم نگاہیں لیے اسے دیکھتے نرمی سے مسکرایا تھا۔

مجھے معاف کر دو لیزے پلیز، غصے میں جانے کیا کیا" بکواس کر بیٹھا، تمھاری وفا شعاری بے لوث خدمت اور محبت میرے لیے کسی قیمتی متاع سے کم نہیں، تم میری زندگی ہو اور میں تمھارے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا، وہ اس کی ٹھوڑی انتہائی نرمی سے اپنے ہاتھ سے تھامے اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا محبت بھرا اظہار اسے سونپ رہا تھا۔

مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی، زہر لگ رہے "
ہیں اس وقت مجھے۔" وہ اسے سہارا دیتے بیڈ تک لائی
اور بیڈ پر بٹھاتے نروٹھے پن سے بولی تو وہ گہرا مسکرا دیا۔
اس کی کلائی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھامے رکھی۔
وہ تو کل نکاح کے بعد اچھے سے طے ہوگا کہ میں "
تمھارے لیے زہر ہوں یا شہد۔" وہ دلکشی سے ہنستے
ہوئے بولا تو لویزا کا چہرہ بھانپ چھوڑنے لگا چونک کر
اس کی جانب دیکھا۔

کل بہت سارے گواہوں اور پختہ ثبوتوں کے ساتھ" نکاح کرتے ہیں لیزا تاکہ پھر کوئی ہمارے رشتے پر انگلی نا اٹھا پائے۔" وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اس پر گہری نگاہیں جمائے کہہ رہا تھا تو لویزا نے سکھ کا سانس لیا۔ شکر ہے وہ بغیر کسی حجت کے اس کے منہ سے اپنی من چاہی خواہش کا اظہار کروانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

اور اگر میں راضی نا ہوئی تو۔" وہ اترائی تھی۔ اب اتنا" کچھ سن کر نخرہ بھی تو دکھانا تھا۔

تو کل میں نے جو کچھ کرنا ہوا وہ میں زبردستی کر" گزروں گا، پھر نتیجہ جو بھی نکلے دیتی رہنا دنیا کو وضاحتیں۔" اس نے انتہائی لاپروائی اور سنجیدگی سے اتنی غیر سنجیدہ بات کی کہ لویزا کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔

بہت فضول گوئی کرنے لگے ہیں آپ۔" لہجہ شکوہ بھرا تھا۔

میری محبت تمھیں فضول گوئی لگتی ہے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

آپ کی یہ بے باک قسم کی دھمکیاں فضول لگتی" ہیں۔" وہ ناک چڑھا کر بولتی اس پر کمبل درست کر گئی۔ میر ہادی نے اس کا چہرہ تھام کر اس کے بھیگی پلکیں اپنے انگوٹھے سے صاف کیں تھیں۔

کتنی مرتبہ کہا ہے رویا مت کرو یار، مجھے تکلیف ہوتی" ہے۔"

حالانکہ ان آنسوؤں کا سبب بھی ہر بار آپ ہی بنتے" ہیں۔"

اب نہیں بنوں گا۔" لہجے میں پختگی تھی۔"

دیکھتے ہیں۔" وہ چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی تو وہ"

مسکرا دیا۔

یقین نہیں آتا ابھی ہم اتنا بڑا جھگڑا کر کے اتنی نارمل"

گفتگو کر رہے ہیں،۔" وہ ہنس دیا۔

کیونکہ یہ میاں بیوی ہونے کی خاص نشانی ہے کہ"

جوڑے اوپر بنتے ہیں صرف جھگڑا کرنے نیچے آتے ہیں

شاید۔" وہ چڑ کر بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ میر

ہادی نے پھر ایک بے باک جسارت کرتے اس کا ماتھا چوما تو لویزا نے وہاں سے کھسکنے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ اور اپنے پاپا کو کال ملائی۔ وہ پہلے ہی آگ کے ڈھیر پر بیٹھے تھے۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی غرا اٹھے۔

"لیزا تم رات کے اس وقت اس شخص کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں۔" وہ اذیت کی انتہا سے چلائے تھے۔ لویزا شرمندگی کے مارے زمین میں جیسے گڑھ گئی۔ اس نے سوچنے کا تکلف نا کیا کہ انھیں اس بات کا کیسے علم ہوا۔ وہ جانتی تھی اس کے بابا اس کی ہر بات سے باخبر ہیں۔

"پاپا، میں میر ہادی سے نکاح کرنا چاہتی ہوں، آپ صبح آجائیے گا اور تمام انتظامات کر لیجئے گا۔" لویزا نے

آہستگی سے کہا تو فون میں چند پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"اور وہ تمھیں پہلے ہی اپنی بیوی سمجھنے والا اس نکاح پر کیسے راضی ہو گیا۔" جانے کیوں لویزا کو اقبال حمید کے لہجے میں میر ہادی کے لیے نفرت ہی نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ایک سرد سی سانس اپنے اندر کھینچی۔

میں نے ان سے کہا کہ ہمارا نکاح نامہ ایکسیڈینٹ" میں سپوئل ہو گیا تو وہ مان گئے۔" لویزا نے انھیں دھیمی سی آواز میں توجیح پیش کی۔

اور اگر کل کو کبھی اس کی یاداشت واپس آ گئی تو؟" اس ذہنی مریض نے پھر سے تمھیں بیچ منجھدار چھوڑ دیا تو؟ تمھارے ساتھ پھر سے برا سلوک کیا تو؟ آئی سوئیر لیزا میں اس آدمی کو شوٹ کروا دوں گا۔" وہ فون میں سے دھاڑے تھے۔ ادھر لویزا پھر سے سسک پڑی تھی۔ اس کی دنیا میں یہ دو مرد تھے دونوں ہی نہایت

جارحانہ اور غصیلے تھے اصل معنوں میں تو وہ اب بھی
بیچ منجدھار ہی پھنسی ہوئی تھی دو کشتیوں (باپ اور
محبت) کے درمیان جھول رہی تھی۔ اس کی سسکی کی
آواز سن کر اقبال حمید خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔

یہ نکاح ایک شرط پر ہوگا لیزے۔" وہ سنجیدگی سے"
بولے تو لویزا چونکی۔

کون سی پاپا؟" اس نے پہلو بدلا۔"

کل سے رانا میر ہادی کی ساری ادویات چینج ہوگی اور"

اس بات کے لیے کہ اس آدمی کی یاداشت کبھی

واپس نا آئے مجھے کسی حد تک بھی جانا پڑا میں جاؤں

گا۔" اقبال حمید نے حتمی لہجے میں کہا تو لویزا نے اپنا

سر تھام لیا۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پاپا۔" وہ چیخ پڑی۔ صدمے"

کی شدت سے آواز پھٹ سی گئی۔

پوری رات ہے سوچنے کے لیے، اچھی طرح سوچ لو"

گڑیا، میں اب اس آدمی کو تمھاری زندگی سے کھیلنے کی

اجازت بلکل نہیں دے سکتا، سوچ کر صبح مجھے فجر پڑھ کر کال کر لینا۔" انھوں نے کہتے فون رکھ دیا تھا۔ لویزا سسک سسک کر رو دی۔

صبح اپارٹمنٹ میں غیر معمولی سی ہلچل تھی۔ وہ ایش وائٹ کلر کی گاون میکسی جس پر ڈل گولڈن کلر کا فینسی کام تھا اس پر تازہ گلابوں کے گجرے ہاتھوں میں ڈالے آسمان سے اتری کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ رانا میر ہادی کے ساتھ ایک پاکیزہ مضبوط بندھن میں تا عمر کے لیے بندھ گئی تھی۔ ،

رانا میر ہادی اس وقت حیرت زدہ ہوا تھا جب نکاح کی تمام قانونی کاروائی اسلام آباد ہائیکورٹ کے سول ججز کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ جبکہ اقبال حمید نکاح کی کاروائی کے بعد بھی میر ہادی سے لیے دیئے انداز میں رہے تو وہ سمجھ گیا بزرگوار کی ناراضگی اس سے اب تک برقرار ہے۔

اس نے چپکے سے لویزا کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا کہ اس کے والد محترم کا منہ کیوں غبارے کی طرح پھولا ہوا ہے تو لویزا نے اپنے پاپا کی نکل اتارنے پر اسے سخت قسم کی گھوری سے نوازا تھا۔ تب وہ بڑی صفائی سے اتنے حضرات کے سامنے اسے ایک آنکھ ونک کر گیا تو لویزا نے گڑبڑا کر نگاہیں پھیر لیں۔

شام تک تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ لاونج میں لویزا اپنے پاپا اقبال حمید کے سینے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔

"پاپا، آپ ناراض ہیں مجھ سے۔" لویزا نے بھیگا لہجہ لیے دھیمے سے پوچھا تھا۔

"ہاں ناراض ہوں، تمھیں اپنی زندگی کے ساتھ اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے تھا لیزے۔" ان کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔

"اچھا اچھا سوچتے ہیں پاپا تو سب اچھا ہوتا ہے، ان شاءاللہ آگے سب اچھا ہوگا۔ اس نے انھیں بچوں کی طرح تسلی دینے کی کوشش کی۔

اگر اس آدمی نے۔" وہ دانت پیس کر کچھ کہنا"
چاہتے تھے جب لویزا نے تیزی سے انھیں ٹوک دیا۔
پاپا پلیز، وہ سن لیں گے۔" وہ روہانسی ہو گئی تو اقبال"
صاحب نے اپنے لب بری طرح بھینچ لیے۔
اس کی صحت کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ میری گڑیا"
"کو ذرا سی بھی تکلیف نا پہنچائے نہیں تو۔
آپ فکر مت کریں انکل میں لیزا کو بیت زیادہ خیال"
،رکھوں گا، اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا

یہ کیسا وعدہ ہے آپ سے۔" وہیل چیئر ان کے قریب

لاتے اس نے مسکرا کر کہا مگر اقبال حمید کا سرد و

سپاٹ چہرہ بے تاثر رہا تو وہ میر ہادی نے ایک سرد سی

سانس اپنے اندر کھینچی۔

"آپ اب تک ناراض ہیں مجھ سے۔" میر ہادی نے

سنجیدگی سے پوچھا تو اقبال حمید نے ایک نظر اس کی

جانب دیکھا جو سفید شلوار قمیض میں بے تحاشہ ہینڈسم

اور ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ وہ خاموش ہی رہے تو وہ پھر

سے بول اٹھا۔

آپ جانے مجھے کیا سمجھ رہے ہیں لیکن اتنا یقین"
رکھیں کہ میں وہ ہوں جو لویزا کو دنیا کی تمام خوشیاں
دے سکتا ہوں، بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر
لویزا کے لیے کچھ بھی کروں گا لیکن اسے کسی چیز
کی کمی نہیں آنے دوں گا، آپ پلیز یقین رکھیں میرا۔"
اس کا عاجزانہ سا لہجہ اقبال حمید تھوڑا بہت پسیج گئے
تھے۔

"گڈینگ مین، ہوپ سو تم اپنے دعوؤں میں کھرے
اترو گے، لیزا میری گڑیا، مجھے جانا ہوگا کسی بھی چیز کی

ضرورت ہوئی تو اذان انکل کو بول دینا۔" اقبال حمید نے کہتے اس کا ماتھا چوما۔ تو لویزا کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ پھر وہ چلے گئے۔ پیچھے وہ اپارٹمنٹ میں تنہا تھے۔

وہ ڈنر کے لیے ڈائنگ ٹیبل پر تھا۔ اور لویزا دلہنا پے کے باجود اس کے لیے ٹیبل پر کھانا چن رہی تھی۔ میر ہادی نے اس کی کلائی تھامی۔

میرے پاس بیٹھو لیزا، ملازمہ کر لے گی ناں، وہ"
جھنجھلایا تو وہ مسکراتی اس کے مقابل چئیر پر بیٹھ گئی۔

دونوں نے ڈنر کیا۔

"آپ کمرے میں چلیں، میں یہ بکھیڑا سمیٹ کر آتی
ہوں۔" لویزا نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا کمرے
میں چلا گیا۔ لویزا نے سارا بکھرا ہوا لاونج اور اوندھا ہوا
کچن ملازماؤں سے صاف کروایا۔ میر ہادی کے لیے دودھ
کا گلاس لیے وہ کمرے کی طرف جانے لگی۔ جب قدم
من من کے بھاری ہو گئے۔

جب کوئی رشتہ نہیں تھا تو وہ رات کو بھی دھڑلے سے اس کے کمرے میں گھس جایا کرتی تھی آج جب اس کے ساتھ ایک مضبوط ترین بندھن میں بندھ گئی تھی تو فطری شرم و حیا اور جھجھک کے باعث اس کا دم نکلنے والا ہو گیا۔ وہ بمشکل کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ آج یہ کمرہ بہت فینسی طریقے سے تازہ پھولوں اور سینٹڈ کینڈلز سے سجا ہوا تھا۔ وہ آج راکنگ چئیر پر ہلکے سے جھولتا کھڑکی سے باہر پورے چاند کو دیکھتے کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ آہٹ محسوس ہوتے میر

ہادی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لویزا جھجھکتے اس کے قریب آئی اور ایک دھیمی شرمیلی سی مسکان چہرے پر سجائے دودھ کا گلاس اور اس کی میڈیسن اسے تھمائیں۔

اس کی یاداشت واپس آنے والی ادویات پر اس نے) اپنے پاپا سی کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ بہت مشکل اور ضد سے انھیں سمجھا ہی لیا کہ جو ہوگا وہ اس کی قسمت اور نصیب کا حصہ ہوگا جو اسے ہر حال میں قبول ہے تو وہ اس شخص کے ساتھ اتنا بڑا ظلم

نہیں کریں۔ تب اقبال حمید کو ایک مرتبہ پھر لاڈلی (بیٹی کے سامنے پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی۔

میر ہادی نے میڈیسن لے کر حسب عادت دودھ کا آدھا گلاس اسے تھما دیا جو لویزا نے پورا پی لیا۔ اس دوران میر ہادی نے اس کا ہاتھ جو مضبوطی سے تھام رکھا تھا بلکل نہیں چھوڑا تھا۔ لویزا گلاس ایک طرف رکھ کر پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ دونوں خاموش تھے۔ کوئی بھی لفظ نا کوئی ایک بھی جملہ۔ بعض دفع شاید ہم خاموش ہوتے ہیں اور ہماری روحیں آپس میں

محو گفتگو ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا تھا شاید۔ لویزا نے اس کے قریب کھڑے ہوتے چاند کو جی بھر کر دیکھا۔ یہ تنہائی، رات کا عالم اور پورے چاند کی چاندنی نوخیز سے جزبات کی شوریدہ سری کو طوفانی قسم کی ہوا دے رہے تھے۔ یہ جان لیوا سی خاموشی بدن میں سنسنی سی دوڑا گئی۔ میر ہادی اب پوری طرح اس کی جانب دیکھتا اسے گہری نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔ اس کی نگاہوں کی تپش سے ہی لویزا کو اپنا جسم پگھلتا محسوس ہوا۔

لویزا کو عجیب لگا۔ وہ کوئی پیش قدمی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے اس کے کل کے رویہ سے ناراض تھا یا اسے آزمانا چاہتا تھا؟

آزمانا اس لئے کہ لویزا کے مطابق اس کے گریز کی وجہ نکاح نامہ تھا۔ تو کیا وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے گریز کی وجہ اس کی معذوری ہے؟ تو کیا آج پہلی پیش قدمی لویزا کو کرنی تھی تاکہ وہ اپنا کہا سچ ثابت کر دے کہ اس کے گریز کی وجہ صرف نکاح نامہ تھا۔ لویزا نے سراسیمگی کی حالت میں اسے دیکھا۔

تب وہ آگے بڑھی۔ جھجھکی۔ رکی۔ لیکن پھر آج خود اس کی آغوش میں بیٹھتے اپنی بانہوں کا ہار اس کی گردن میں پہنا دیا۔

اس کی اس پیش قدمی بھری حرکت پر وہ گہری آسودگی لیے مسکرایا تھا۔

تو ہمارے بیچ ظالم سماج وہ نکاح نامہ تھا؟" اس کی" آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

"بلکل، تو کیا آپ کو اب بھی یہی لگ رہا تھا کہ میں وہ بات مکمل نہیں کر پائی گہرے دکھ سے لہجہ بھرا گیا۔ "آپ میرے بارے میں اتنا نیگیٹو کیسے سوچ سکتے ہیں۔" اس کی آنکھیں نم ہوئیں تو رانا میر ہادی تڑپ اٹھا۔ اس کے نازک نرم و ملائم وجود کے گرد بانہوں کا مضبوط ترین حصار کھینچا۔

"ایسا بلکل نہیں ہے لیزا، میں بس آج تمھیں تمھاری دل کی رضامندی سے پانا چاہتا تھا، اور کوئی وجہ نہیں میری جان۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ لویزا نے

گہرا سانس بھرا۔ میر ہادی نے چیئر کی پشت سے اپنا سر ٹکایا اور اس کے پورے وجود کو اپنی نگاہوں کی تپش سے جھلسا دیا۔

"بندہ بشر ہوں، رحم کھائیں محترمہ، اس قیامت خیز حسن کے ساتھ یوں بندہ ناچیز کے دل پر بجلیاں گرانا کہاں کا انصاف ہے؟ محبت کی چاشنی میں ڈوبے لہجے میں کہتا وہ اس کی کلائی میں ایک قیمتی ترین بریسلٹ پہنا گیا۔ لویزا کو خوشگوار ترین حیرت ہوئی۔

"یہ آپ نے کب لیا؟" وہ کلائی آگے پیچھے کر کے دیکھتی میر ہادی کو ایک معصوم سے بچی لگی تھی۔

"ان لائن پسند کر کے آج ہی پارسل منگوایا تھا۔" اس نے نرمی سے کہا اور گہری دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"منہ دکھائی پسند آئی میری جان کو۔" کہتے میر ہادی نے اس حسب عادت اپنے ہاتھ کی پشت سے اس کی ملائم گال سہلائی تھی۔

منہ دکھائی دینے والا زیادہ پسند ہے مجھے۔" لویزا نے لبوں پر شرمیلی سی مسکان سجائے دھیمے سے کہا اور پھر بڑی ہمت کر کے لرزتے کپکپاتے ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور پھر جھک کر اس کے کشادہ گرم ماتھے پر اپنے نرم گلابی مگر ٹھنڈے لب رکھے تو رانا میر ہادی کو ان لبوں کی مسیحائی اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ بہت آہستگی سے بڑی توجہ کے ساتھ اس کے پورے چہرے پر اپنی محبت کے پھول برسا کر اسے معتبر کرنے لگی۔ میر ہادی نے خود کو اس وقت

ہواؤں میں اڑتے محسوس کیا تھا کہ چاہے جانے کا احساس ہی اس قدر لذت آمیز ہوتا ہے کہ انسان دنیا بھلا دے۔ وہ اتنی سی پیش قدمی پر ہی بری طرح ہانپ گئی تو وہ گہرا مسکرا دیا۔

اگر پتہ ہوتا نکاح نامے کا کاغذ حاصل کرنے پر اتنا" بڑا انعام ملے گا تو کب کا یہ کارنامہ سر انجام دے لیتا وہ دھیمے سے کہتے ہنس دیا تو لویزا نے شرماتے ہوئے " اس کے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔ پورے چاند کی چاندنی نے دونوں پر

اپنے گھرے روشن پر پھیلا دیئے تھے-- تاکہ اگلا دن کا
روشن سورج بھی انھیں اس دائمی ملن اور نئی زندگی کی
شروعات پر ایک دوسرے کے سنگ آگے بڑھتے دیکھ
کھلے دل سے خوش آمدید کہہ سکے-- ہوا میں ملن کی
خوشبو رچی بسی تھی-- دفعتاً بادلوں نے آسمان سے
چھٹتے چاند کو اس کا راستہ دیتے اپنے ساتھ اسے بھی
اس خوبصورت ملن کا گواہ بنتے ان پر جیسے میٹھی چاندنی
کے پر پھیلا دیئے--

وہ لاؤنج میں بیٹھا بے صبر سے اس کا انتظار کر رہا تھا وہ آج بی ایس سی کا اپنا آخری پیپر دینے گئی تھی۔

میر ہادی کو آہٹ محسوس ہوئی تو وہ بلکل تیار ہوا۔ لویزا اپنے دھیان میں لاونج میں داخل ہوئی اور سامنے کا نظارا دیکھ کر چیخ اٹھی۔

"میر ہادی آپ۔" وہ بغیر کسی سہارے کے بلکل سامنے اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ لویزا بھاگ کر اس کی کھلی ہوئی باہوں میں سمائی تو رانا میر ہادی نے مسکرا کر اس کے گرد اپنا حصار مزید تنگ کر لیا۔

آپ ٹھیک ہیں ناں، پیروں میں درد تو نہیں۔" اس کے سینے سے چہرہ نکال کر لویزا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ ان کتھئی آنکھوں کے سمندر میں ڈوب کر ابھرا۔

"بے حد معمولی سی لنگڑاہٹ ہے، تھراپسٹ نے کہا کچھ دنوں تک وہ بھی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے جھک کر اس کی چھوٹی سی ناک کو اپنے دانتوں میں دباتے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ ہمیشہ یہی کرتا تھا۔ جب دل کرتا کہ وہ اس کی مترنم دھیمے سروں

سی ہنسی کی جلترنگ سنے وہ یونہی اس کی ناک اپنے دانتوں میں دھیمے سے دبا لیتا تو وہ ہمیشہ کھل کر ہنس دیتی۔

کیا ہوا ایسے کیسے دیکھ رہے ہیں۔"تین ماہ ہو چکے تھے نکاح کو، پھر بھی ان نگاہوں کی خوابیدہ سے جذبوں کو آنچ دیتی بھڑکتی سی لپک اب تک ناقابلِ برداشت ہی تھی۔

"جان میں تمھیں ایسے ویسے جیسے کیسے سب طرح سے دیکھ سکتا ہوں، پرمٹ ہے میرے پاس۔" وہ کافی ترنگ میں بولا تھا۔

"کوئی حال نہیں قسم سے۔" وہ اس کی اس قدر سر پھری دیوانگی پر افسوس ہی کر سکتی تھی۔

"روم میں چلیں۔" میر ہادی نے اس کے کان میں میٹھی دھیمی سی سرگوشی کی۔

ہم شرافت سے کچن میں چل رہے ہیں۔" اس نے" کندھے اچکائے۔

بہت ظالم ہو۔" وہ کراہا تو وہ ہنس دی۔"

کمرے میں ہلکی روشنی تھی، کھڑکی سے آتی ہوا میں پردے لہرا رہے تھے۔ میر ہادی بیڈ پر نیم دراز تھا، بال بکھرے ہوئے، اور ایک عجیب سی بے چینی دل و جاں میں سرائیت کر رہی تھی۔ لویزا نے کہا تھا وہ اپنے بی

ایس سی کے لاسٹ ائیر کے پیپر دینے والی ہے۔ اسی لئے اب وہ کمرے کے ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی پڑھائی میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ کئی بار اس کو پکار چکا تھا مگر وہ شاید کسی فارمولے تھیوری میں ایسا مصروف تھی جو اس سے بھی زیادہ، ضروری تھا اب کی بار وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا آہ بھر کر رہ گیا۔۔

"واہ بھئی، بیوی تو سامنے ہے، مگر لگتا ہے شوہر کا کوئی وجود ہی نہیں کوئی اہمیت نہیں۔"

لویزا جو کب سے اس کی بے چینی نوٹ کر رہی تھی اس کو پتہ تھا اب وہ کوئی اور ہتھکنڈا آزمائے گا مگر کتاب سے سر اُٹھائے بغیر کافی مصروف سا انداز تھا۔

"ہادی پلیز ڈرامے بند کریں مجھے یہ اسائمنٹ مکمل کرنی ہے۔" وہ اس وقت وائیوا کہ تیاری میں مصروف تھی۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے" ہادی نے آہستہ آہستہ کمبل اُٹھایا، زمین پر پٹخ دیا۔ بیڈ کے ساتھ لپٹ کر بیڈ پر پڑی پلیٹ زمین بوس ہوئی اس نے بہت اچھے سے اسکی بات مانتے آخر میں ایک دھماکا کیا تو لویزا چونکی۔

"یہ کیا تھا۔؟" لویز کی آنکھیں پھیل گئیں پلٹ کر ذرا سا پیچھے دیکھا۔۔

"میرا دل تھا، وہ بھی ایسے ہی گرا ہے آپ کی مصروفیت اور بے توجہی کے نیچے۔" اس نے بہت ہی بیزار سی شکل بنائے ہوئے شکوا کیا تو لویزا نے اسے گھور کے دیکھا، مگر ہنسی دبا نہ سکی۔

"آپ سنجیدہ نہیں ہو سکتے کبھی۔؟" لویزا نے کمر۔ل پر ہاتھ رکھے بولا تو ہادی نے اسے گھورا مگر پھر سے بولا۔۔

ہو سکتا ہوں، جب بیوی سنجیدگی چھوڑ دے، جس میں" ایک بوڑھی روح حلول کر گئی ہے پھر شاید، کیونکہ ابھی تو دنیا جہاں کی سنجیدگی میرے کڑوی ایلویرا نے سما رکھی ہے خود میں۔" وہ اس کے حسین چہرے پر نگاہیں جمائے تو لویزا نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے دوبارہ کتاب میں نظریں گاڑھ دیں۔

ہادی نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑا پین اٹھایا اور نیچے پھینک دیا۔ "ٹک" کی آواز پر لویزا نے پیچھے دیکھا تو سر پیٹ کر رہ گئی --

"ہادی!! یہ کیا بچپنا ہے؟"!۔ لویزا کی آنکھیں پھیل گیئں۔

"تو اب تمھارے پاس تو شوہر کے لیے وقت نہیں تو چیزوں سے دل بہلا رہا ہوں۔" اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا، جیسے دلیل دے رہا ہو۔۔۔

"میں کہہ رہی ہوں نا ابھی مصروف ہوں۔" وہ آخری بار اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

اور میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم اور تمہارا وقت ابھی"

کے ابھی چاہیے، یہاں میرے پاس میرے بہت

قریب۔" اس کی بچگانہ سی خواہشوں میں بھی گہری

سنجیدگی تھی۔ لویزا نے کتاب بند کی اسکی طرف آئی۔

حفظ ماتقدم کے طور پر تھوڑا پیچھے کھڑے ہوئی۔

کیا چاہتے ہیں آپ؟" وہ تنک کر بولی تھی۔"

جبکہ میر ہادی اسے خود تک آتے دیکھ اور اس کی تمام

تر توجہ کامیابی سے حاصل کر لینے پر فاتحانہ مسکراہٹ

سے اسے دیکھا۔

چاہتا تو میں بہت کچھ ہوں، جسے ابھی بتا دیا تو"

تمہارے ہوش اڑ جائیں گے اسی لیے وہ چاہت رات

"کو بتاؤں گا، مگر فی الحال بیوی کا کچھ وقت چاہیے۔

وہ لاپروائی سے بولا۔

اور اگر بیوی وہ وقت نہ دے تو۔؟"لویزا نے مصنوعی"

غصے کا اظہار کیا۔

تو شوہر پھر آہستہ آہستہ پورا کمرہ تہس نہس کر دے"

گا۔" اُس نے ٹیبل پر پڑی چیزوں کی طرف معنی

خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا تو لویزا نے سر پکڑ لیا۔

آپ ایک ضدی بچے سے بھی خطرناک ہیں۔" وہ"
جھنجھلا گئی۔

اور آپ دنیا کی سب سے حسین ٹیچر ہیں، جو اپنے"
دیرینہ اور دلعزیز شاگرد کو نظر انداز کر رہی ہیں۔" ہادی
نے فوراً حساب بے باک کیا تو وہ نفی میں سر ہلا گی --

کتنے ڈرامے باز ہیں آپ!" اسکے شوشے پر لویزا کی"
ہنسی چھوٹ گئی--

ڈرامے باز نہیں، عاشق ہوں، اور جب محبوب کا"
وقت نہیں ملے تو شور مچانا لازمی ہوتا ہے، پھر چاہے وہ
شور دل مچائے یا رومان پرور جذبوں کی مہک" میر ہادی
نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا سا کھینچا تو وہ اسکے سینے پر آ
گری--

آخرکار، یہ ننھی سی چڑیا ایک باز کے شکنجے میں پھنس"
ہی گئی، اب یہ باز آپ پر اپنی محبت لٹانے سے بلکل
باز نہیں آئے گا، تم جس پل مجھے پوری طرح میسر آ
جاؤ میری جان تو اس پل میں دنیا کا خوش قسمت ترین

انسان بن جاتا ہوں۔" اس نے اسکے بالوں کی خوشبو کو خود میں اتارے ہوئے کہا تو لویزا نے نفی میں سر ہلا کر اسے دیکھا۔

"خوش نصیب وہ ہوتا ہے جو بیوی کو تنگ نہ کرے۔" لویزا نے نروٹھے پن سے کہا تھا۔

(اس بندے کی نفرت اگر بے پایاں تھیں تو محبت تو اس چھوٹی سی جان کے لیے اس سے بھی کئی گناہ زیادہ خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی محبتیں اس پر اتنی شدت سے لٹاتا کہ وہ گھبرا ہی جاتی تھی۔

ارے، تنگ کرنا تو محبت کی پہچان ہے،" ہادی نے" مسکراہٹ دبا کے کہا، "اگر شوہر شرارت نہ کرے تو بیوی کے لبوں پر مسکراہٹ کون لائے گا۔" اس کا لہجہ پھر سے بھاری ہونے لگا۔ لویزا کی ہنسی چھوٹ گئی اور یہ مدھر جلترنگ سننے کو ہی تو وہ کب سے اوٹ پٹانگ حرکتیں کر رہا تھا، لویزا نے شرارت چھپانے کے لیے نظریں جھکائیں۔

"آپ حد درجہ ڈرامے باز ہیں ہادی۔"

ڈرامہ باز نہیں، محبت میں تھوڑا پاگل ہوں۔" اس

نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگایا تو لویزا خود

میں سمٹ سی گئی۔ اس کے قریب ہوتے اس کو اپنا

آپ مزید انمول لگنے لگا تھا دنیا جہاں کا سکون اس

شخص کی آغوش میں مل جاتا تھا۔

مگر دل کے کونے میں اب بھی کہیں نا کہیں ایک)

بے چینی سی سکون نہیں لینے دیتی تھی کہ اس سکون

کا خزانہ تا عمر اس کے پاس نہیں رہ سکتا۔ آخر کب

تک۔ اس کی یاداشت واپس آنے کے بعد ان کے اس

اٹوٹ رشتہ کے کیا مستقبل ہوگا۔ اور اگر اس نے اسے چھوڑ دیا تو وہ کیسے رہ پائے گی اسکے بغیر اسی وجہ سے وہ اس سے گریز برتنے کی کوشش کرتی تھی۔ کہ شاید اس کو اس شخص کی عادت اتنی پختہ نا ہو مگر کہاں وہ سرپھرا شخص اسے خود سے ایک پل کے لیے بھی دور نہیں ہونے دیتے تھا۔

ہادی کے ہاتھ خود بخود اُس کے بالوں میں الجھ گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا جیسے ہر الجھن کھول دینا چاہتا ہو۔

"پتہ ہے لیزے، جب تم میرے پاس ایسے آ کر بیٹھتی ہو، میری باہنوں میں سمٹ جاتی ہو تو لگتا ہے دنیا پر باقی ہر چیز بے معنی ہے۔" ہادی نے مدھم آواز میں کہا۔

لویزا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اسکے گرد بازو حمائل کیے۔

"آپ کو ہمیشہ اتنی بڑی بڑی باتیں کیوں سوجھتی ہیں؟"

ہادی نے سر جھکایا، اور اسکی گردن پر نرم سا بوسہ دیا۔

"کیونکہ تم میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہو۔"

لویزا کا دل جیسے ایک پل کو تھم سا گیا۔ اُس نے ذرا سا چہرہ اٹھایا، نگاہوں کا تصادم بڑا دلفریب اور جان لیوا تھا۔ وہ ایک بھی لفظ کہے بغیر نگاہوں کے ذریعے ہی ایک دوسرے کے سکون کا سبب بن گئے۔ ہادی نے آہستگی اور نرمی سے اُس کے گال سہلائے۔۔

تمہاری یہ خاموشی سے دی گئی خود سپردگی دل کو"
عجیب سا سکون دیتی ہے۔" وہ خوابناک سے لہجے میں
دھیمے سے بولا۔ لویزا نے لبوں پر مچلتی شرمیلی سی
مسکراہٹ دبانے کی ناکام کوشش کی، اور پھر
دھیرے سے اُس کے سینے سے لگ گئی۔ ہادی
نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، جیسے پورا جہاں اُس
پل میں سمیٹ لیا ہو۔

ایسے ہی رہو ہمیشہ میرے پاس۔" اُس نے سرگوشی"
کی۔۔ لویزا نے آنکھیں بند کر لیں، اور اُس پل میں

دونوں صرف ایک دوسرے کی دھڑکنیں سن رہے تھے۔۔

یہ اگلے دن کی بات تھی جب کچن میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لویزا ایپرن پہنے بڑے انہماک سے کھانا تیار کر رہی تھی۔ بال ایک طرف سمٹے ہوئے، چہرے پر ہلکی سی سنجیدگی، مگر آنکھوں میں وہی نرم چمک تھی جو ہادی کے دل کو ہمیشہ بے قرار کر دیتی۔ ہادی جو کمرے میں بور ہو رہا تھا اب نیچے آیا تو اسے کام کرتے دیکھا۔

دروازے سے ٹیک لگائے اُسے دیکھتا رہا، پھر آہستہ سے

بولا،

بیگم، کب تک اس کچن میں ہلچل مچائیں گی آپ؟"
کبھی شوہر کے دل میں بھی اپنی محبت سے زرا ہل چل

پیدا کیجیے۔" اس کی بات پر لویزا نے ذرا مڑ کر اُسے

گھورا۔

ہادی!، یہ کچن ہے، آپ کا بیڈ روم نہیں۔" اس کی"

بات پر ہادی مسکرایا، آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے اُس کے

پاس آیا۔

کچن ہو یا بیڈ روم، بیوی جہاں ہو، وہی شوہر کی دنیا" ہے،" وہ شیلف پر دونوں ہاتھ رکھتا ہتھیلیوں کے بل تھوڑا سا پیچھے کو جھکتا بولا تو وہ اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا گئی۔

آپ باز نہیں آئیں گے ناں۔" اسے پھر سے خود کو" زچ کرنے پر آمادہ ہوتے دیکھ لویزا بری طرح جھنجھلائے تھی۔ اور ادھر جانے کیوں اسے اس دشمن جاں کو تپا کر اسے تنگ کرنے میں اس قدر مزا آتا تھا۔ اب بھی وہ آکر اس کے سر پر سوار تھا۔ ہادی نے چپکے سے

پاس پڑی سبزیوں کی ٹوکری کو ہلکا سا دھکیلا تو سکیب پر ادھر ادھر لڑھک گئیں--

ہادی!!!! یہ کیا حرکت ہے؟" لویزا نے گھور کر" اسے دیکھتے ہوئے کہا جبکہ وہ آرام سے کھڑا صرف اسے کی دیکھ رہا تھا--ہادی نے کندھے اچکائے۔

اس وقت یہ سبزیاں مجھے رقیب لگ رہی ہیں اس" لئے انہیں کاٹ ڈالوں گا، ابال ڈالوں کا جلا ڈالوں گا۔" وہ بلند آواز میں کہتے کٹنگ نائف اٹھا گیا۔

لویزا نے گھور کر دیکھا، مگر ہادی کی آنکھوں کی شرارت پر ہنسی دبانا مشکل ہو گیا۔وہ خاموشی سے قریب آیا، پاس پڑے خشک آٹے میں دو انگلیوں سے تھوڑا سا آٹا لگا کر لیزا کے گال پر لگا دیا۔

ہادی! آج مجھے لگتا ہے آپ نے کھانا نہیں، یہ چمٹے کھانے ہیں۔"لویزا نے مصنوعی غصے سے کہا۔ تو ہادی نے شرارت سے آٹے کی ہلکی سی لکیر اُس کے گال سے لے کر گردن تک کھینچ دی۔۔

اس کی اس حرکت پر لیزا کا کانوں میں بجنے لگا۔

ہادی پلیز یہ بچپنے والی حرکتیں چھوڑ دیں آپ!" اس" نے دھڑکتے دل پر قابو پاتے کہا ورنہ وہ اسکی تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بیوی کے ساتھ بچپنا ہی تو سب سے بڑی محبت" ہے۔" ہادی نے خمار بھرے لہجے میں کہا اور اسے سر تا پیر ایسی نگاہوں کے حصار میں رکھا تو لویزا کے ماتھے پر پسینے کی ننھی بوندوں نمودار ہوئی۔ جیسے ہی ہادی کا ہاتھ اسکی گردن پر آکر رکا تو گردن کی ایک طرفہ کچھ

نشانات پا کر اسنے لب دانتوں تلے دبایا اور اپنی آٹے سے آلود انگلیوں سے اس نشان پر ہلکا سا رب کیا۔

"یہ نشانات مٹنے نہ دینا، شوہر کی محبت کی مہریں ہیں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے ذو معنی بات کی تو لویزا کا چہرا سرخ پڑ گیا دھڑکنیں بے قابو ہوتی سرپٹ دوڑنے لگیں۔۔ لویز کچھ کہہ پاتی، اس سے پہلے ہادی نے اُسے باہوں میں اُٹھا لیا۔

"میر ہادی! وہ چلا اٹھی۔ مجھے نیچے اتاریں کیا کر رہے ہیں آپ۔" وہ مچلی مگر وہ فورا اسے لیے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔۔

"میری جان من پسند بیوی کو زمین پر نہیں اتارا جاتا، سر کا تاج بنایا جاتا ہے، دل کے قریب رکھا جاتا ہے۔"وہ اسکی کمر پر گرفت سخت کرتا اسے لیے اندر کی جانب بڑھا اور اندر آکر آہستگی سے اسے نیچے اتارا۔ لویزا کا سانس بے ہنگم سا تھا، گالوں پر آٹے کی سفیدی، آنکھوں میں جھجک اور ہونٹوں پر ہلکی

مسکراہٹ۔ وہ اس کے دیونہ پن کی شوریدہ سری پر بندھ نہیں باندھ پارہی تھی۔ اس کی دیوانگی کی کوئی حد قائم نا رہی۔

آپ کو تو بس موقع چاہیے۔" وہ اب اسے گھور رہی" تھی۔

ہادی نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر نرمی سے اوپر کی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں، کیونکہ یہ دیوانہ اپنی بیوی کو پوری طرح ان نگاہوں میں بسا لینا چاہتا ہے اتنا کہ باقی دنیا ان آنکھوں میں دھندلا جائے۔" اس کی اس قدر شدت پر جھنجھناتے اعصاب کے ساتھ گھبراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ہادی، م، مجھے کھانا بنانا ہے۔" وہ منمنائی۔

"لیکن مجھے کھانا نہیں کھانا۔" وہ مزید شوخی و شرارت پر اتر آیا۔ میر ہادی نے اُس کا آٹا لگا ہاتھ تھاما اور دھیرے سے سائیڈ ٹیبل پر پڑے ٹیشو پیپر سے اسکے

ہاتھ کی ایک ایک انگلی بڑی توجہ اور محبت سے صاف کرتے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے دل کے مقام پر رکھا۔

یہاں سنو، یہ دھڑکن تمہارے نام کی ہے۔" وہ بہکتے" سے لہجے میں بولتا لویزا کو بھی اپنے ساتھ بہکانے لگا۔

وہ خود میں سمٹی سی اس کے ارادے بھانپ کر اپنے پر سمیٹنے لگی۔ مگر شخص کی پاگل قربت ایسا پنجرہ تھی جس میں وہ اس کی سانسیں تک قید کر دیتا تھا۔ لویزا کا دلکش صبیح چہرہ اسکی حرکتوں اور باتوں پر سرخ ہونے

لگا تھا یہ آدمی کتنا بے باک تھا اسے اب اندازہ ہو رہا تھا۔

"بہت ہی کوئی فضول انسان ہیں آپ، آپ اتنے بے باک ہیں مجھے اندازہ نہیں تھا۔" اپنی شرم و حیا اور شدید قسم کی گھبراہٹ کو اس نے غصے کے پیرائے میں چھپا کر سٹپٹاتے ہوئے کہا تو وہ مدہم سا مسکرایا جب کے اس کے ہاتھ اس کے گرد مضبوط ترین حصار کھینچ گئے۔

محبت کا ذائقہ ہمیشہ تھوڑا تیز ہوتا ہے بیگم ورنہ مزہ" نہیں آتا۔" اس نے ذو معنی انداز میں کہا تو وہ بے حد خجل ہوئی۔ لیکن اس کی پیش قدمی قبول کرنے کا انداز یوں تھا کہ لویزا کے انگ انگ سے مسرت کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ میر ہادی نے آہستہ سے اُسے اپنے قریب کیا، اُس کے ماتھے پر طویل تر بوسہ دیا لویزا نے اُس کے سینے پر سر رکھ دیا، دل کی دھڑکنوں کی آواز ایک ہو گئیں۔ دونوں خاموش تھے، مگر خاموشی کے بیچ محبت کی گفتگو گونج رہی تھی۔

ان تین ماہ میں میر ہادی نے واقعی اسے پلکوں پر بٹھا کر رکھا۔ دنیا جہان کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دیں۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے سوسائٹی کے پارک میں چہل قدمی کر رہا تھا اور گہری دلچسپی سے پارک میں کھیلتے بچوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو بچے کیسے لگتے ہیں میر ہادی؟" خود میں آنے والی بڑی تبدیلی کو محسوس کر لینے کے باعث لویزا نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"بچے کس کو اچھے نہیں لگتے ایلویرا، میں چاہتا ہوں ہمارے ڈھیر سارے بچے ہوں، وہ مسکرا کو بولتا پارک میں کھیلتے بچوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے، وہ اچانک اس کے سامنے آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ میر ہادی چونک گیا۔ "ابھی کنفرم نہیں ہے لیکن شاید

آپ پاپا بننے والے ہیں۔" لویز نے اس کے سر پر دھماکا کیا۔

"ویٹ، واٹ؟؟ وہ چلا اٹھا اور اسے کندھوں سے تھامتے جیسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی ایسی چمک تھی جو ناقابلِ بیان تھی۔ لویزا کھلکھلا کر ہنس دی۔

لیکن اتنی زیادہ خوشیوں کو نظر بھی بہت زیادہ اور بہت جلد لگ جاتی ہے۔

بھائی؟ میر ہادی بھائی؟ میرے بھائی؟ ایک دل ہلا" دینے والی تکرار سن کر وہ دونوں چونک کر ایک طرف متوجہ ہوئے تھے۔

شامیر جو اپنے دوست کے ساتھ ڈی ایچ کیو اسلام آباد فیز ون میں کسی بہت ضروری کام سے آیا تھا۔ وہاں موجود ایک پارک میں ایک شخص کو دیکھتے پہلے تو وہ یہ سمجھا اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مگر جب وہ بے قرار سا ہوتے ان کے قریب آیا تو اس کے پیروں تلے سے

زمین سرک گئی۔ وہ تڑپ کر اسے پکارتا اس کی جانب

لپکا۔

"ش،شامیر۔؟؟؟ اٹک اٹک کر میر ہادی کے منہ سے

ادا ہونے والے لفظ نے لویزا میر ہادی کو لٹھے کی مانند

سفید کر دیا تھا۔ اسے یوں لگا آج یوم حساب ہے۔

شامیر آ کر میر ہادی کے مضبوط و توانا جسم سے سختی

سے لپٹ گیا۔ ادھر میر ہادی اپنی جگہ پر پتھر بنا جم

چکا تھا۔ یہ لمس جانا پہچانا تھا۔ یہ خوشبو اسی کے خون

کی مانوس سی خوشبو تھی۔ میر ہادی کے توانا بازو خود بخود اس شخص سے لپٹ گئے۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے بھائی، ہم نے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا آپ کو، پورے پاکستان کی خاک چھان لیں مگر آپ کہیں نہیں ملے، عالی بھائی کس قدر پریشان تھے، انھوں نے میں نے کتنا ڈھونڈا آپ کو۔" وہ مسلسل رو رہا تھا۔ شامیر جانے پہچانے نام لے رہا تھا۔ میر ہادی کے دماغ پر دباؤ بڑھنے لگا۔ سر میں درد کی ٹیس اٹھی تو اپنی کنپٹیوں کو وہ بری طرح مسلنے لگا۔

"اب آپ ہمیں چھوڑ کر کہیں مت جانا بھائی، بھائی۔" شامیر گڑبڑا گیا۔ کیونکہ رانا میر ہادی کا سر اس کے کندھے پر ایک جانب ڈھلک گیا تھا۔ وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ لویزا کی بھی لکھے سے چیخ نکل گئی۔ وہاں موجود لویزا کی جان پہچان کے لوگوں نے اور شامیر نے رانا میر ہادی کو اٹھا کر اس لویزا کی نشاندھی پر اسے اس کے گھر تک پہنچایا۔

مبارک ہو، یہ تاثرات یاداشت واپس آنے کے بھی ہو" سکتے ہیں، جس طرح ان کے بھائی سے ان کی اچانک ملاقات ہوئی، ان کے بھائی نے انھیں ان کی پچھلی زندگی کے بارے میں باتیں کیں، ان کا یہ اثر ہوا کہ ان کی پچھلی یادوں کی یلغار سے دماغ میں دباؤ پیدا ہوا اور م یہ بیہوش ہو گئے، باقی سب ٹھیک ہے، ان کی یاداشت واپس آ سکتی ہے۔" ڈاکٹر نے میر ہادی کے مکمل چیک اپ کے بعد لویزا عالی (جو کہ شامیر کے اطلاع دینے کے بعد فورا وہاں پہنچا تھا) اور شامیر کو

بتایا تھا جو اپنی اپنی جگہ بلکل خاموش تھے۔ ڈاکٹر جا چکا تھا۔ شامیر نے اجنبی کاٹ دار نگاہ لویزا پر ڈالی جیسے پوچھنا چاہتا ہو تم کون ہو اور تمھیں کس نے حق دیا میرے بھائی کو ہم سے اس طرح چھین کر دور کرنے کا۔۔

"جیسے تم سوچ رہے ہو ویسا کچھ نہیں ہے، لویزا نے بے تاثر چہرہ لیے بولنا شروع کیا۔ اور شروع سے لے کر آخر تک اسے تمام کہانی کہہ سنائی۔ تب لاونج میں

موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ ان کے پاس جیسے الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔

"جو بھی ہوا بلکل ٹھیک نہیں تھا، لیکن معاف کیجئے گا آپ مان لیجئے کہ میر ہادی کے مکمل صحت یاب ہونے کے بعد آپ بے تحاشا خود غرض اور مطلبی تھیں، صحت یاب ہونے کے بعد انھیں ہم سے ملا سکتیں تھیں آپ؟ میر ہادی کا خاندان جو ان کے لیے خون کے آنسو رویا، دوست احباب ، کیریر اور کاروبار گیا بھاڑ میں، جس کے بارے میں ایک پل کے لیے بھی

نہیں سوچا آپ نے۔" شامیر نے سرخ آنکھیں لیے چابک سے الفاظ ادا کیے تو لویزا نے زرد چہرہ بھیگی پلکیں لیے بری طرح اپنے لب کاٹے۔

تم چاچو بننے والے ہو شامیر۔" شامیر اس بات پر" بھونچکا سا اس نازک پاکیزگی میں لپٹی لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا جو اب اس کے بھائی کی بیوی تھی۔ وہ بول کچھ رہا تھا اور سامنے سے اس نے جو خبر سنائی وہ اسے زمین سے آسمان تک پہنچانے کو کافی تھی۔

"آپ جو ہمیں اور ہمارے خاندان کو دینے جا رہی ہیں "اس کے صدقے آپ کے تمام گناہ معاف بھابھی۔

وہ دانت پیس کر کہتا اٹھ کر میر ہادی کے پاس گیا تو اس کی تقلید میں عالی بھی اندر چلا گیا وہ بے دریغ روتے ہوئے کرب میں ڈوبی مسکرا دی تھی۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی تو لویزا نے سسک کر روتے فون اٹھایا۔

"لیزے میری جان، میری گڑیا کیا ہوا ہے؟ وہ لوگ کون ہیں جو تمھارے گھر میں موجود ہیں؟" اقبال حمید

نے بے قراری سے پوچھا کچھ اس کی سسکیاں ان کا دل دہلا رہی تھیں۔

"بابا وہ میر ہادی کے گھر والے ہیں ان کی یاداشت واپس آگئی ہے۔" وہ کہتی سسک پڑی۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا ناں، اب کیا ہوگا کیسے وہ شخص۔" وہ چلا کر کچھ کہنا چاہتے تھے جب لویزا نے انھیں ٹوک دیا۔

کچھ بھی ہو بابا، چاہے کچھ بھی ہو، آپ دخل نہیں دیں گے آپ کو میری قسم، آپ میرا مرا ہوا منہ دیکھیں گے اگر اب آپ نے کسی پر کوئی دباؤ ڈالا۔" وہ بے تحاشا رو رہی تھی بس یہی کہنے اقبال حمید کو کال کی تھی۔ یہ کہتے ان کے مسلسل بولنے کے باجود وہ فون رکھ چکی تھی۔

اسے ہوش میں آئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ وہ لال انگارا آنکھیں، بھنچے جبڑے اور بند مٹھیاں لیے مسلسل

کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں گاڑھے بیٹھا تھا۔ اتنے
عرصے کے بعد ملنے کے باجود بھی شامیر اور عالی کو میر
ہادی نے خود کو کمرے میں تنہا چھوڑنے کا کہا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ کیسی یاد تھی؟ کیسا ماضی تھا۔ کیسی آگہی تھی جو
اس کی دنیا میں اذیتوں ، تکلیفوں اور درد کے نئے
باب رقم کرنے آئی تھی۔ وجود شکستہ اور دل غموں

سے بوجھل ہو چکا تھا۔ ہر سانس جیسے سینے پر ایک
بوجھ کی طرح گرتا محسوس ہوا تھا۔۔ دنیا کی ساری
رونقیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں، اور
دل میں ایک بے نام سا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ مستقبل
کی ساری امنگیں، خواب، اور خواہشیں جیسے شکستہ
سفینے کی طرح طوفان میں بہہ گئے تھے۔ ہر گزرا لمحہ
اس کے دل پر جیسے بوجھ ڈال رہا تھا، اور ہر یاد اسے
مزید ٹوٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔۔ وہ ٹوٹ چکا تھا بکھر
چکا تھا جسے نا کوئی سمیٹنے والا تھا نا جوڑنے والا۔۔ دل و

روح کے زخموں سے خون رس رہا تھا اور یہ زخم ناسور بننے والے تھے۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔

کیوں۔ کیوں ۔کیوں۔؟

ایک انا پرست شخص کی انا کو بری طرح کچل دیا گیا تھا۔ ایسا خود پسند ، خودی میں ڈوبا ، نخوت زدہ، احساس برتری کا شکار غصیلا نخریلا اور اکھڑ مزاج۔ اپنی خودی سے نیچے جھک کر کہاں گوارا تھا کسی کو اس خوش فہمی میں مبتلا کرنا کہ رانا میر ہادی اس کے لیے کوئی احساسات بھی رکھتا ہے۔

ہر گز نہیں۔ کبھی نہیں۔

صبح سے رات ہو چکی تھی وہ کمرے میں تنہا پڑا تھا۔ اور اب رات کے دس بجے شامیر اور عالی اس کے پاس تھے۔ باہر ایک بھیانکر طوفان آیا ہوا تھا۔ طوفانی ہوائیں کھڑکیوں سے ٹکرا ٹکرا کر ہولناک سی آواز پیدا کر رہی تھیں جیسے کہنا چاہتی ہوں آج سب کچھ تنکوں کی طرح بکھیر کر تباہی برباد کر دیں گی۔ طوفانی موسلادھار بارش سب کچھ اپنے ساتھ بہانے آئی تھی جیسے۔

بلاؤ اسے، کہاں ہے وہ، اسے فیصلہ سناؤں تاکہ اپنے گھر جا سکیں ہم۔" رانا میر ہادی انتہائی سفاکی سے بولا تھا۔ شامیر اور عالی اس کی جانب دیکھ کر رہ گئے جو آگ کے ڈھیر پر بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ مگر اس کی حالت ایسی تھی وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ تبھی شامیر اٹھا اور لویزا کو بلا لایا۔ صبح کے بعد اب وہ ایک دوسرے کے مقابل آئے تھے۔

جانی پہنچانی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے شکستہ قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی

تھی۔لویزا نے ایک نگاہ؟ صرف ایک نگاہ اٹھا کر اس ہرجائی سفاک شخص کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا ان سوجی ،روئی سرخ آنکھوں میں التجائیں؟ منت؟ وفاؤں کی یاد دہانی؟ محبت کے واسطے؟

مگر وہ بے حس سفاک انا پرست شخص سب کچھ نظر انداز کر گیا یوں جیسے اسے کبھی رستے میں ہی نا ملا ہو۔ اس کی وفائیں، وفا شعاری اس کا خلوص خدمتیں۔ کتنی جلدی سب کچھ بھول گیا تھا یہ ہرجائی۔ صرف آدھے دن میں۔

میر ہادی کی حقارت و شرر انگیز نگاہ اس پر پڑی تھی۔ آنکھوں کے بھڑکتے شعلے سب کچھ جلا کر خاکستر کرنے کو تھے۔

"میری کہی آخری گفتگو کو بہت سیریس لے لیا تم نے، میں نے کہا تھا اپنے باپ کو کہو تمھیں کوئی کاٹھ کا الو لے دے، اس نے دے دیا، چاہے اس کاٹھ کے الو یا تمھارے من پسند کھلونے کو لولا لنگڑا یا آدھا پاگل کر کے ہی تمھیں کیوں نا دینا پڑا، ایسا ہی ہے ناں؟"

اس کا لہجہ قینچی سی کاٹ رکھتا تھا۔ اس کا لہجہ درانتی کی طرح دل و روح کی رگیں کاٹ گیا تھا۔ لویزا نے بڑی سختی سے اپنی مٹھیاں اور جبڑے بھینچیں۔ چہرہ سرد و سپاٹ اور بے تاثر ہی تھا۔

"طلاق دے رہا ہوں تمھیں، چاہتا تو ابھی زبانی کلامی دے سکتا تھا، لیکن وہ کیا ہے ناں صبح میرا لوئر آ کر تمام قانونی کارروائی کرے گا، نہیں تو یہ ناں ہو تمھارا طاقتور باپ اس زبانی طلاق کو بھی جھوٹا ثابت کر کے بیٹی پھر سے اسی شخص کے سر نا تھوپ دے جو اسے

چھوڑ چکا ہو۔" وہ لفظوں سے اس کی روح پر چابک برسا رہا تھا تبھی اس کے اندر دھجیاں سی اڑتی محسوس ہوئیں۔ وہ اس سے زیادہ نہیں سن سکی۔ وہ اس سے زیادہ سن بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک دفع پہلے اس کے ایسے ہی الفاظ سن کر وہ موت کو گلے لگانے والی تھی۔ اب ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اسی لیے وہاں سے جلدی نکل آئی۔ اب اس کے ساتھ جڑی ایک ننھی سی جان کا سوال تھا۔

تبھی کچھ کہے سنے بغیر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے اپنا کچھ ضروری سامان پیک کیا۔ اور اس طوفانی رات میں اذان کے ساتھ اپارٹمنٹ سے نکل گئی تھی۔

میر ہادی کو اس کی خاموشی بھی دھڑ دھڑ جلتی بھٹی میں گھسیٹ گئی تھی۔ دل میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ شامیر اور عالی کو اتنا بھی پوچھنے کی جرات نا ہوئی کہ اسے اتنا کچھ بول

کر یہاں بیٹھا کیوں ہے؟ یہاں سے نکل کیوں نہیں جاتا۔ عالی بڑی مشکلوں سے لیکن واپس چلا گیا۔ شامیر اور میر ہادی نے یہ طوفانی رات اسی اپارٹمنٹ کے اسی کمرے میں آنکھوں میں کاٹ کر گزاری تھی۔ رانا میر ہادی راکنگ چیئر پر بیٹھا ساری رات کھڑکی میں بیٹھا باہر اندھیرے اور طوفان کو گھورتا رہا۔

اب صبح کے نو بج چکے تھے۔ آخر شامیر ہی اس کے قریب آیا تھا۔

میر ہادی، کیا سچ مچ چھوڑ دو گے انھیں۔" شامیر نے بڑی دقتوں سے پوچھا تھا۔

ہونہہ،، تمھیں کیا لگتا ہے شامیر اسے اتنے سستے میں چھوڑ دوں گا؟ اس کے باپ کے طاقت کے گھمنڈ کو خاک میں نا ملایا تو میرا نام رانا میر ہادی نہیں جاؤ اسے بول دو ہمارے خاندان میں طلاقیں نہیں ہوتیں، وہ مر تو سکتی ہے لیکن رانا میر ہادی کے نام سے آزاد نہیں ہو سکتی، اور میں اب ساری زندگی نا اسے چھوڑوں گا نا اپنے پاس رکھوں گا، وہ میری بیوی ہوگی

صرف نام کی۔" اس کے لہجے میں اژدھوں سی پھنکار تھی۔ شامیر افسوس سے سر ہلاتے باہر نکلا مگر ٹھٹھک گیا۔ اپارٹمنٹ پوری طرح خالی تھا۔ ملازمین میں سے کوئی بھی اس وقت یہاں موجود نہیں تھا۔ وہ انھیں قدموں کمرے میں واپس آیا۔

بھائی، بھابھی اپارٹمنٹ چھوڑ کر جانے کہاں چلی گئیں ہیں۔"

شامیر نے اس کے سر پر آسمان گرایا۔

لیکن اسے (بظاہر) رتی برابر بھی پرواہ نہیں تھی۔

"جانے دو جہاں جاتی ہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وہ زہر خند ہوا۔

جب آپ نے انھیں چھوڑنا ہی نہیں تھا تو رات"

طلاق کی بات کیوں کی تھی۔" شامیر بری طرح

جھنجھلایا تھا۔

اسے تکلیف دینے کے لیے۔" میر ہادی نے بڑے"

اطمینان سے کہا تھا۔

انھیں تکلیف دے کر پھر پوری رات خود کیوں نہیں سوئے تھے، خود کیوں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔" شامیر نے اس کا محاصرہ کرنا چاہا۔

"وہ میرا مسئلہ ہے شامیر۔" وہ لاپرواہ تھا۔ جامد پتھر سا سخت اور ساکت۔ شامیر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اب آگے کیا؟ ان کے پاس آپ کا بچہ ہے بھائی۔" شامیر اس کی ضد، ہٹ دھرمی، بے حسی اور خود اذیتی کی انتہائی سے زچ ہو چکا تھا۔

شامیر چلو یہاں سے۔" وہ پھر سے پتھریلے لہجے میں" بولتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کا کوئی سامان؟"

شامیر یہاں کی کوئی چیز میری نہیں، کچھ نہیں لینا" مجھے۔" وہ دھاڑا تھا۔ (لیکن ہاں اپنا آف کیا ہوا موبائل نم وحشت زدہ نگاہیں لیے چپکے سے جیب میں ضرور ڈال لیا)۔ وہ دونوں وہاں سے نکل آئے تھے۔

وہ ترکی آئی تھی اور اب اپنی نانو کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ اب اس ملک میں نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر کار اس بے درد ہرجائی کی یاداشت واپس آنے کے بعد اس کا یہی تو ٹھکانہ تھا۔ اس کا لاشعور یہ سب جھیلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔؟ یا ایک خوف تھا۔ کہیں وہ اسے چھوڑ نا دے۔ وہ خود کے ساتھ بندھی ایک امید کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی۔ لیکن اس کے نام کے بغیر؟ بلکل نہیں۔

اسی لیے اس ظالم شخص سے منہ چھپا کر ترکی چلی آئی تھی۔

طبیعت کافی بوجھل تھی۔ نانو کو ناکام محبت کا قصہ سنا کر بھی دل ہلکا نا ہوا تو وہ زیادہ ٹینشن برداشت نا کر سکی اور اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔

وہ اس وقت حویلی میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔ تمام کمرہ تہس نہس کر کے بھی دل میں بھڑکی آگ ٹھنڈی

نا ہو رہی تھی۔ ان دھماکوں کی آواز سن کر شامیر دہل کر اس کے کمرے میں آیا تھا۔ اپنے بھائی کی ایسی اجڑی بکھری دردناک حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آئے تھے۔ کمرے میں پڑی کرسی سے ایل ایل ڈی دھماکے سے پھوڑتا وہ کوئی جنونی لگ رہا تھا۔ شامیر نے اسے پشت سے قابو کیا۔ وہ اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔

"بھائی پلیز، خدا کے لیے سنبھالیں اپنے آپ کو، آپ کو اللہ کا واسطہ۔" شامیر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ تب وہ

پھوٹ پھوٹ کر روتا زمین پر سجدے کی حالت میں بیٹھتا چلا گیا۔

"شامیر، میرا دل درد سے پھٹ جائے گا، میرے سینے میں آگ لگی ہے یار، میں مر جاؤں گا۔" وہ بے تحاشا روتے ہوئے بے بسی کے عالم میں اپنا سینا مسلنے لگا۔

ابھی کچھ گھنٹوں پہلے کی بات تھی۔ نور پیر کے وقت اس نے اسلام آباد حمید ولا کے گیٹ پر ایک طوفان بدتمیزی مچا دی تھی۔ وہ اندر جانا چاہتا تھا۔ گارڈز کی ایک بھاری نفری اسے روک رہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا وہ

دیو ہیکل ڈھیر سارے گارڈ اس پر ہاتھ نہیں اٹھا رہے تھے۔ اندر سے ایک ملازم آیا تھا اور اس نے میر ہادی کو اندر آنے کا کہا تھا۔ وہ آگ کا طوفان بنا توڑ پھوڑ مچاتا بنگلے کے بڑے سے لاونج میں داخل ہوا تھا۔

"مجھے تو پہلے سے ہی پتہ تھا تم ایک ذہنی مریض ہو، آج تمھاری حرکتوں سے کنفرم بھی ہو گیا، تمھاری جرات؟"

"میری جرات کا اندازہ آپ یہاں سے لگا لیں کے آپ کے ہی گھر میں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

کھڑا ہوں حالانکہ جانتا ہوں آدھی دنیا جانتی ہے یہاں سے ہوا غائب بندہ دوبارا نہیں ملتا۔" اس کے لہجے کا تمسخر اقبال حمید کو بری طرح سلگا گیا تھا۔

لویزا کہاں ہے؟" وہ قہر بار لہجے میں غرایا تھا۔ اب" کی بار ایک تمسخرانہ سی مسکراہٹ اقبال حمید کے لبوں کو چھو گئی تھی۔

تم تو اس کو طلاق دے رہے تھے تو اب کیوں دم" ہلاتے آ گئے ہو یہاں۔" انھوں نے تاک کر وار کیا تھا۔

طلاق دے رہا تھا مگر نہیں دی، اب اسے اپنی معمولی" سی باندی جو بنا کر رکھنا ہے ساری زندگی، اسی لیے لینے چلا آیا۔" وہ کافی اطمینان سے بولا تھا جبکہ اقبال حمید کا چہرہ غیض و غضب کی شدت سے لہو چھلکانے لگا۔

"اپنی گھٹیا بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

وہ دھاڑے تھے۔

لویزا، لویزا، فورا سے پہلے باہر نکلو۔" وہ تحکم بھرے" لہجے میں پکار رہا تھا۔

تمھاری اوقات اور حثیت نہیں کہ میری بیٹی اپنے"
پاس رکھ سکو، اسے بھی شاید پتہ چل گیا تھا اس لیے
تم سے جان چھڑا کر ملک چھوڑ کر بھاگ گئی۔" اقبال
حمید نے اب کی بار انتہائی متنفر سے لہجے میں کہا تو مہر
ہادی کی رگیں یوں پھول گیئں جیسے ابھی پھٹ پڑیں
گی۔

"یہ تو آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ وہ مجھ سے
جان چھڑا کر نہیں بھاگی، اس لئے بھاگی ہے کہ کہیں
میں اسے چھوڑ نا دوں، ایسا ہی ہے ناں، آخر عشق کرتی

ہے مجھ سے، کیسے برداشت کر سکتی ہے میں اسے چھوڑ دوں تبھی میری وجہ سے آپ کو چھوڑ گئی۔" وہ ان کا تمسخر اڑا رہا تھا۔

مجھے امید ہے وہاں رہ کر اس کے سر سے عشق کا" بھوت جلد اتر جائے گا، تب اسے خلع دینے کے لیے تیار رہنا۔" وہ بھڑک اٹھے۔

وہ بھوت تو اس کے سر سے کبھی نہیں اترے گا" خیر، آپ کا یہ خواب ہی رہ جائے گا کہ میں اسے چھوڑوں گا یا وہ مجھ سے خلع لے گی، آخر مرتی

ہے مجھ پر، میں کہوں گا تو اپنی جان بھی مجھے دے دے گی، جیسے پہلے دینے کی کوشش کی تھی، ہر بات سے باخبر ہوتے ہیں آپ، یہ بھی اچھے سے جانتے ہوں گے وہ میری خاطر ایک مرتبہ خود کشی کی کوشش کر چکی ہے، میرے ایک اشارے پر میری ملازمہ بھی بن جائے گی۔"

"شٹ یور ماؤتھ گھٹیا بیغیرت انسان، اور اس سے پہلے میں تمھیں شوٹ کر دوں دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اقبال حمید حلق کے بل دھاڑے تھے۔

خیر وہ تو آپ چاہ کر بھی مجھے نہیں کر سکتے آخر آپ"
کی جان سے پیاری بیٹی کی جان جو مجھ میں اٹکی ہوئی
ہے۔" وہ جاتے جاتے بھی انھیں آگ لگانا بھولا نہیں
تھا۔ لیکن بنگلے سے نکلتے ہی اسے یوں لگا تھا اس کے
دماغ میں چھوٹے چھوٹے دھماکے ہو رہے ہیں۔

وہ اسے چھوڑ گئی تھی؟

یہ بات ناقابل برداشت واقع ہوئی تھی۔

اور اب وہ سب کچھ تہس نہس کرنے کے در پہ تھا۔

بے دریغ روتے اپنے آنسو بے دردی سے رگڑ ڈالے۔

ایک دم سیدھا ہو کر زمین پر پرسکون ہو کر بیٹھتے بیڈ سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا کر اپنے عنابی لبوں میں دبائی تھی۔ شامیر بے بسی سے اسے دیکھے گیا۔

کتنی نادان ہے ناں جو سمجھتی ہے میں 'جھک' جاؤں گا، وہ چلی گئی اور اسے لگتا ہے مجھ جیسا انا پرست اس کے پیچھے جائے گا؟ کتنی بھولی ہے ناں۔" وہ اب بھیگی لہو چھلکاتی آنکھیں لیے ہنس دیا تھا۔

بھائی آپ دونوں کی اس انا کی جنگ میں اس ننھی" جان کا کیا قصور ہے یار۔" شامیر اپنے خاندان کے سود کے لیے تڑپ رہا تھا۔ تبھی اسے ہوش دلانے کی کوشش کی مگر وہ تو اپنا حساب کتاب سود و زیاں ہار جیت کے گورکھ دھندے میں الجھا ہوا تھا اسے اپنی یا کسی اور چیز کی ہوش ہی کب تھی۔؟

وقت بہت سبک رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ڈیلیوری کے نزدیک وہ نانو کے ہمراہ پاکستان واپس آ گئی تھی۔ نانو

کا گھر اسلام آباد بحریہ ٹاؤن میں تھا۔ اقبال حمید نے
اسے بے حد فورس کیا کہ وہ اپنے گھر آ ئے۔ لیکن
جانے کیوں وہ حمید ولا واپس نہیں آنا چاہتی تھی۔
لویزا کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہتی تھی۔ نانو سعدیہ
خاتون نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ ڈاکٹرز کے
مطابق وہ بہت زیادہ ڈپریشن میں تھی۔ لویزا نے لاکھ چاہا
تھا کہ وہ اس کے بارے میں نا سوچے مگر اپنی لامتناہی
سوچوں پر اختیار ہی کب تھا اس کے پورے دن چل
رہے تھے جب اچانک اس کے بابا اس کے پاس چلے

آئے۔ اس کی طبیعت بہت خراب تھی اسی لیے اسے گھر میں ہی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اقبال حمید اس کے سرہانے بیٹھے اس کا سر دبا رہے تھے۔ چہرے پر گہرا دکھ اور آنکھوں میں اپنی بچی کی دگرگوں حالت دیکھ کر نمی تھی۔

بابا، اس عرصے میں وہ کبھی میرا پوچھنے آئے تھے؟"

لویزا کی نقاہت بھری آواز میں کیے گئے سوال پر اقبال حمید کے دل و جاں جیسے سلگ اٹھے تھے۔

نہیں، وہ نہیں آیا کبھی۔" اقبال حمید نے بڑی دقتوں سے کہا۔ اگر سچ بتاتے تو کیا کہتے وہ کیا کہنے آیا تھا یہ کہ ان کی بیٹی کو لے جا کر اپنی باندی یا ملازمہ بنانا چاہتا ہے؟ اس سے اچھا تھا اس حالت میں انھوں نے اس سے جھوٹ بول دیا تھا۔ یہ سن کر لویزا کے سینے میں کچھ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ تبھی بے آواز آنسو کنپٹیوں سے گر کر تکیہ بھگونے لگے۔ اس کی اتنی طبیعت خراب ہوئی کے گھر سے اسے ہاسپٹل منتقل کرنا پڑا۔ اسی رات اس نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم

دیا تھا۔ جو ہو بہو اپنے باپ کی کاربن کاپی تھا۔ تیکھے کھڑے مغرور نقوش پوری طرح اپنے باپ سے چرا کر وہ لویزا کی گود میں تھا۔

زاروں میر ہادی۔" لویزا زرد رنگت لئے اسے گود میں" لیے بیٹھی تھی۔ اقبال حمید اور نانو اس کے پاس تھے۔ منظر مکمل ہو کر بھی پوری طرح ادھورا تھا۔ لویزا کے آنسو اس کے اندر ہی کہیں سینے میں گرتے برف ہونے لگے۔

وہ بے حس شخص بظاہر خود پر بے حسی طاری کیے
ہوئے تھا لیکن اس نے اسے ڈھونڈنے کو پورے
اسلام آباد کی خاک چھان لی تھی۔ پھر بہت ہی زیادہ
مشکلوں سے میر ہادی کو پتہ چلا تھا وہ دل و جان کا
آزار بنی لڑکی ترکی میں ہے۔ تب وہ ترکی بھی گیا تھ۔
لیکن اسے وہاں بھی کچھ نا ملا۔ وہ اپنے بچے کے لیے
بھی اتنا تڑپا تھا جتنا ایک باپ تڑپ سکتا ہے۔ لیکن
اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ تب اس کے دل
میں اقبال حمید کے نفرت دن بہ دن بڑھتی ہی گئی

جس نے نا اسے یہ بتایا تھا کہ وہ کہاں پر ہے بلکہ اپنی تمام تر سورس استعمال کر کے رانا میر ہادی کو اس سے دور رکھا تھا۔ یہ نفرت کیا رنگ لانے والی تھی یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

پھر آخر کار اس کی سن لی گئی۔ اور پورے ایک سال دس ماہ بعد اسے اس کا اتہ پتہ معلوم ہوا۔ وہ ایک کمپنی میں کام کر رہی تھی۔

وہ اسی دن اس آفس میں جا پہنچا تھا۔وہاں کے ڈائریکٹر مسٹر زیان سے ملاقات کی۔ میر ہادی نے اسے دور سے

دیکھا تھا۔ شیشے کے اس پار وہ اپنے کیبن میں ایک فایل پر جھکی ہوئی تھی۔ اورنج براؤن شیڈ کے شلوار قمیض کے اوپر ہم رنگ دوپٹہ سلیقے سے سر پر جما رکھا تھا۔ وہ قاتل حسینہ پہلے دن سی دلکش اور خوبصورتی کی جیتی جاگتی مورت دکھائی دی تھی۔ ایک پتھر دل پتھر سے تراشے مورت۔ ظالم ، بے حس اور بے درد؟

اسے وہاں دیکھ کر رانا میر ہادی کے تن بدن میں آگ کے بھانبھڑ جلے اٹھے۔ اس کی زندگی برباد کر کے ، اس کی زندگی کو آگ لگا کر ، اس کا سکھ، سکون چین

نیندیں سب حرام کر کے وہ اتنے سکون میں تھی؟ سچ میں؟

اس کا صبیح کتاب چہرہ پرسکون تھا۔ رانا میر ہادی کا دل کیا اس کے سر پر جا پہنچے اور اس کو یوں جھنجھوڑ ڈالے کہ اس کی یہ لاپروائی ، بے اعتنائی اور بے نیازی خاک میں مل جائے۔ وہ کوئی ایسا ہی عزم لیے وہاں سے نکلا تھا۔ رانا میر ہادی کا ارادہ اس پرسکون اور ہموار جھیل میں ایک بڑا پتھر پھینک کر ایسی ہلچل

مچانے کا تھا کہ اس کا بھی سکون ، چین نیندیں سب برباد ہو جائیں۔

سر پر ایسا جنون سوار تھا کہ نا اپنے نقصان اور خسارے کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں کی اور اس ڈوبتی کمپنی کے ساٹھ فیصد شیئرز خرید ڈالے۔

زارون، یار کپڑوں سے کیا پرابلم ہے آخر تمھیں؟"

"کیوں ننگا رہنا پسند کرتے ہو؟ بے حیا حیا نہیں آتی۔

وہ سوا سالہ زارون کے پیچھے بھاگ کر پاگل ہو
گئی تھی جو اس کے ہاتھ آتے آتے چکنے گھڑے کی
طرح پھسل جاتا تھا۔ آفس جانے کے لیے کافی لیٹ
ہوچکی تھی۔ اس کے بابا نے زارون کے لیے دو دو
گورنس رکھ کر دے رکھی تھیں۔ زارون تقریباً نو ماہ کا تھا
جب اپنی سوچوں اور اذیتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے
کو اس نے اسلام آباد میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں
جاب کر لی تھی۔ زارون بے حد شرارتی اور ہائبر ایکٹو بچہ
تھا۔ جسے سنبھالنے میں لویزا کے دانتوں سے پسینہ

چھوٹ جاتا۔ ہوتا بھی کیوں نہیں آخر رانا میر ہادی کا خون تھا۔ لویزا اقبال کا جینا حرام نا کرتا تو کس کا کرتا؟ بمشکل اسے کپڑے پہنا کر نانو کے حوالے کیا اور خود جلدی سے تیار ہو کر گاڑی لے کر آفس کے لیے نکلی۔ راستے میں اسے اقبال حمید کی کال آئی تھی۔ٹریفک سگنل پر رک کر فون کو دیکھ اس نے انتہائی بیزارگی سے کال پک کی۔

اسلام و علیکم پاپا، کیسے ہیں آپ؟" لہجہ کافی پُرتکلف" تھا۔

وعلیکم السلام، کیسا ہے میرا بچہ اور ہمارا جگر گوشہ" کیسا ہے، وہ زارون کی بات کر رہے تھے۔

بلکل ٹھیک ہے پاپا، بہت پریشان کرتا ہے۔" وہ" اب مدعا بھلائے ان سے نارملی گفتگو کر رہی تھی۔

لیکن پھر۔

ہاں تو جب اس کا کوئی سرپرست ہوگا تو تمھیں اسے" اکیلا بلکل نہیں سنبھالنا پڑے گا، لیزے خدا کے لیے مان جاؤ، کورٹ سے خلع لینا میرے بائیں ہاتھ کا

کھیل ہے، میرے دوست کا بیٹا بہت سلجھا ہوا ہے لیزے وہ زارون کو بھی اپنانے کے لئے۔

"خدا کے لیے پاپا بس کر دیں، آپ میرا جواب جانتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں میرے ساتھ ایسا، آپ جانتے ہیں میں مر سکتی ہوں لیکن اس رشتے سے الگ نہیں ہوسکتی، اب آپ نے دوبارا مجھ سے اس متعلق بات کی تو میں آپ سے بات ہی نہیں کروں گی پاپا۔" وہ آج چیخ پڑی اسی لئے جب بولی تو بولتی چلی گئی۔

میں اسے راستے سے ہی ہٹا دوں گا۔" نفرت انگیز لہجے میں کہتے وہ دھاڑے تو لویزا کے پیروں تلے سے زمین کھینچ گئے تھے یوں لگا جسم سے جان کھینچ لی گئی ہو۔

"تب میرے جنازے کو بھی کندھا دینے کے لیے تیار رہیے گا آپ۔" غم و غصّے کی انتہا سے آواز پھٹ گئی۔ اس نے کہتے فون بند کرتے ائیر پوڈ نکال کر پیسنجر سیٹ پر اچھالا۔ اس کا دماغ پوری طرح الٹ چکا تھا۔۔ آفس پہنچ گئی تھی اسی لیے گھرے گھرے

سانس بھرتے خود کو نارمل کیا۔ بمشکل خود کو گھسیٹتی عمارت کی دوسری منزل پر لائی اور اپنے کیبن میں آ گئی۔

آفس کا ماحول بہت ہی زیادہ اچھا اور دوستانہ تھا۔ جسے فی الحال کمپنی کے مالک مسٹر کمال کے بیٹے مسٹر زیان دیکھ رہے تھے کیونکہ کافی دنوں سے مسٹر کمال کی طبیعت ناساز تھی۔ شادی شدہ مسٹر زیان بھی کافی نفیس طبیعت کے مالک تھے جو تمام ایمپلائز سے کافی احترام سے پیش آتے تھے ان کی موجودگی میں آفس کی

ہر لڑکی بے حد کمفرٹیبل محسوس کرتی تھی۔ دو ماہ پہلے کمپنی خسارے میں چل رہی تھی تب کسی دوسری کمپنی نے اس کمپنی کے ساٹھ فیصد شیئرز خرید کر اس میں بڑی سرمایہ کاری کی تھی۔ تب کمپنی دوبارا چل پڑی۔

آج بھی آفس میں کافی افراتفری کا عالم تھا۔ سنا تھا کے آج کمپنی کے شیئرز خریدنے والے مالک تشریف لا رہے تھے اور باقاعدہ آج سے جوائن کرنے والے تھے۔

لیکن اسے آج کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دماغ مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دن بدن پاپا کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ لے۔ جس کی وجہ سے اس کو بے حد ذہنی دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے آفس سے بلایا آیا تھا کیونکہ وہ زیان صاحب کی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔ وہ ضروری فائلز اٹھا کر آفس تک آئی ہلکی دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔ تبھی دروازے پر ہی قدم جم سے گئے تھے۔ سانس سینے میں ہی کہیں اٹک گیا۔ وہ

سانس نہیں لے سکی تھی۔ حملہ بہت اچانک ہوا تھا۔

وہ اپنی جگہ پر پتھرا سی گئی تھی۔ تقریباً پونے دو سال

بعد وہ پتھر دل درد گر شخص اپنی تمام تر وجاہت، غرور

اور تمکنت سمیت سیاہ ڈنر سوٹ میں ٹھیک اس کے

سامنے باس والی سیٹ پر بڑی شان سے براجمان تھا۔

میر ہادی نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس کے ہونق اور

حیرت سے پھیلتی کتھئی آنکھوں پر ڈالی۔ (بیشک اس

سے نگاہ ہٹانا میر ہادی کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام

تھا لیکن پھر بھی) اور نگاہ پھر اپنے موبائل پہ جما
دی--

آئیے آئیے مسز لویزا بیٹا، فائلز ریڈی ہیں؟" زیان"
صاحب کو ہی اسے مخاطب کرنا پڑا جو دروازے میں جمی
ہوئی تھی۔

جس سر، وہ فوری طور پر سنبھلی تھی۔ وہ شخص مکمل"
اجنبیت اختیار کیے ہوئے تھا لویزا کے دل و دماغ میں
درد کے جھکڑ سے چلنے لگے لیکن پھر بھی خود پر قابو

پاۓ رکھا۔ آگے بڑھی اور زیان صاحب کو فائلیں پکڑا دیں۔

"لویزا، ان سے ملئے یہ مسٹر رانا میر ہادی ہیں آپ کے نئے بوس، آج سے آپ ان کو اسسٹ کریں گی، زیان صاحب نے کہتے اس کے جسم سے رہی سہی جان بھی نکال دی تھی۔ اس کی زبان تالو سے چپک گئی۔ زیان صاحب نے اسے کچھ ضروری کام کی ہدایت دی اور جانے کا کہا تو وہ سر پر پیر رکھ کر آفس سے بھاگی اور اپنے کیبن میں آکر گہرے گہرے سانس بھرے۔

یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا تھا؟ محض اتفاق تھا یا کچھ اور؟ وہ بلکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سوچ سوچ کر پاگل ہوتے اس کا دماغ سن ہو گیا تھا۔ دراصل اب وہ خود میں اتنی بھی سکت نہیں پا رہی تھی کہ اس سنگدل ہرجائی کے مزید طعنے تشنے ، کڑوی زہریلی باتیں یا کوئی ایسا فیصلہ سنتی جسے سن کر وہ واقعی مر جاتی۔ تبھی لمحوں میں ایک نتیجے پر پہنچی تھی۔

میر ہادی اسے آفس سے باہر جاتا دکھائی دیا تھا۔ تب محض پانچ منٹ میں اس نے اپنا ریزائن لیٹر ٹائپ کر

کے اس پر سائن کیا اور دستک دے کر زیان صاحب
کے آفس میں داخل ہوئی تھی۔

کہیے لویزا بیٹا، آپ کو کچھ کہنا ہے۔" زیان صاحب"
نے حسب معمول اسے بات کرتے جھجھکتے دیکھا تو
نرمی سے پوچھا تھا۔

سر یہ میرا ریزائن لیٹر ہے، پلیز اسے ایکسیپٹ کر"
لیں۔" اس نے دھیمے سے کہتے ٹیبل پر اپنا استعفی رکھا

تو زیادہ صاحب ششدر سا ہوتے اس کی جانب دیکھا اور ریزائن لیٹر اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

ادھر رانا میر ہادی جو دروازے میں کھڑا تھا اس کے پیر وہیں دروازے میں ہی جم گئے۔

"آپ نے اس میں کمپنی سے ڈیزائن کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں لکھی بیٹا۔" ان کے پوچھے گئے ایک ویلڈ سے سوال پر لویزا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ کر رہ گئی۔ مگر اگلے ہی پل اسے دھچکا سا لگا تھا جب زیان صاحب استعفٰی دینے کی وجہ کی تہہ تک پہنچ گئے۔

نئے بوس کی وجہ سے ریزائن دے رہی ہیں لویزا، تو"
آپ انتہائی کم عقلی اور غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی
ہیں کسی کو جانے پرکھے بغیر آپ کس طرح کسی کا
کریکٹر اسسمینٹ دے سکتی ہیں۔" وہ اب اس سے باز
پرس کر رہے تھے۔ لویزا کیا کہتی خاموش رہی۔

لویزا بیٹا، رانا میر ہادی بظاہر بہت روڈ لگتے ہیں، لیکن"
ہیں بہت نفیس اور باکردار ہیں، وہ بہت بے ضرر
ہیں۔" (جی بلکل، یہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا

ہے کہ وہ کتنے ہی بے ضرر ہیں۔ پاگل ۔ بے نتھا

(بیل۔ غصیل اور گھمنڈی

"اچھا میری بات مانیں، میرے کہنے پر ایک ہفتے تک اپنی جاب کنٹینیو رکھیں، اگر کوئی بات بری لگی یا یہاں آپ کے مزاج کے خلاف ہوئی تو میں اسی وقت یہ ریزائن ایکسیپٹ کر لوں گا۔" زیان صاحب نے نرمی سے کہا تو لویزا نے گہری سانس خارج کرتے اثبات میں سر ہلایا۔ زیان صاحب نے وہ لیٹر اٹھا کر دراز میں رکھ دیا۔ لویزا چپ چاپ کمرے سے باہر نکلی۔ میر ہادی

تیزی سے دیوار کی اوٹ میں ہوا تھا۔ وہ اپنے کیبن میں چلی گئی۔ اس کے بات آف ہونے تک وہ پورا دن اسے دکھائی نا دیا تھا۔

اس نے ایک دھماکے سے پاس پڑا گلدان اٹھا کر دیوار پر پھوڑا تھا۔

یعنی کہ اس کی اتنی ہمت تھی کہ میر ہادی کے وہاں آنے پر پھر سے وہاں سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اب کی دفع میں تمھارا قبر تک پیچھا کروں گا لویزا

میر ہادی۔

میر ہادی کا خون خواہ مخواہ کھولتا رہا۔

وہ لاؤنج میں زارون کو سریلیک کھلا رہی تھی اور سامنے بیٹھے اپنے پاپا کو جو نانو سے باتوں میں مشغول تھے بری طرح نظر انداز کر رہی تھی۔ اقبال حمید کب سے اس

کی خاموشی نوٹ کر رہے تھے۔ جب یوں لگا لان میں ایک طوفان بدتمیزی سا برپا ہوا ہے۔

"یہ کیا، ؟ ہو کیا رہا ہے یہاں؟ اقبال حمید گارڈز پر چلائے تھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کا پارہ آسمان چھونے لگا جب رانا شاہ میر دریاب گارڈز کو پیچھے دھکیلتا لاونج میں داخل ہو چکا تھا۔ لویزا اسے دیکھ دم سادھ گئی تھی۔

"تم؟ تمھاری جرات کیسے ہوئی ادھر کا رخ کرنے کی، میں تمھیں شوٹ کر دوں گا۔" اقبال حمید دھاڑے

تھے۔ مگر شامیر کسی کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ اس کی جان تو اس ننھی سی جان میں جان اٹکی تھی جس کے چھوٹے چھوٹے نین نقوش ہوبہو اس کے بھائی سے ملتے تھے۔ شامیر نے لپک کر زارون کو اپنی باہوں میں بھرا تھا۔

"خبردار میرے نواسے کو ہاتھ لگایا، میں تمھارے یہ غلیظ ہاتھ توڑ دوں گا، آج تم دونوں بھائیوں کو جہنم واصل کر کے ہی دم لوں گا۔" کہتے اقبال حمید شامیر کی جانب لپکے تھے مگر درمیان میں لویزا آ گئی۔

"میرے، آپ کریں بس لیے کے خدا پاپا، اٹ سٹاپ

معاملات سے دور رہیں، میں خود ہی ہینڈل کر لوں گی

سب۔" لویزا نے بے تاثر لہجے میں کہا تو اقبال حمید

وہیں ساکت ہو گئے تھے۔

شامیر دیوانوں کی طرح زارون کو پیار کر رہا تھا اور حیرت

انگیز طور پر نا وہ رویا نا گھبرایا تھا بلکہ اپنی بڑی بڑی

آنکھوں سے ٹکر ٹکر اس شخص کو دیکھے جا رہا تھا۔

"بھابھی، باہر گاڑی میں بھائی زارون کا انتظار کر

رہے ہیں، میں اسے ان سے تھوڑی دیر ملوا لاتا ہوں،

وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔" شامیر نے لویزا کی جانب دیکھ کر اس سے پوچھا نہیں تھا صرف بتایا تھا۔ وہ بلکل ساکت تھی۔ لیکن اقبال حمید کو پتنگے ضرور لگے تھے۔

لویزا یہ غلطی مت کرنا وہ پاگل آدمی ہمارے بیٹے کو" چھین لے گا ہم سے۔" اقبال حمید چلائے تھے۔ لویزا نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی شامیر بول اٹھا۔

ہم جیسے بھی ہیں کم از کم آپ جتنے کم ظرف نہیں ہیں جنھوں نے ایک بیوی کو اس کے شوہر سے اور ایک بیٹے کو اس کے باپ سے چھین کر الگ کیا ہوا ہے۔" شامیر کے متنفر لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

اقبال حمید کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا جبکہ لویزا نے حیرت سے شامیر کی جانب دیکھا۔

"بھابھی آپ کو جانے پتہ ہے یا نہیں لیکن بتاتا چلوں کہ آپ کے جانے کے بعد بھائی آپ کو لینے آئے تھے لیکن آپ کے والد محترم نے نا صرف انھیں اپنے گھر

سے بے عزت کر کے نکالا بلکہ بھائی کو یہ تک نہیں
بتایا کہ آپ کہاں ہیں، حتیٰ کہ بھائی آپ کا جہاں
سے اتا پتا کروانے کی کوشش کرتے وہاں سے آپ
کے والد محترم تمام ڈیٹا غائب کروا دیتے، باپ تو بیٹیوں
کا گھر بسانا چاہتے ہیں لیکن ان کی بھائی کے لیے اس
"بلا وجہ کی نفرت نے آپ کا گھر برباد کر دیا ہے۔
شامیر کہہ کر رکا نہیں زارون کو لے کر باہر نکل گیا
جبکہ لویزا کو لگا اس کے سر سے چھت چھن گئی ہے
وہ ننگے سر آبلہ پا بھڑکتے صحرا میں کھڑی ہے۔ لویزا

نے اقبال حمید کی جانب دیکھا جو شکستہ سے وہاں کھڑے تھے جنھوں نے ایک مرتبہ بھی شامیر کی کسی بات کی نفی نہیں کی تھی۔ مطلب وہ سب بول رہا تھا۔

"لیزے میری گڑیا، وہ مجھ سے عجیب طرح کے بکواس کر رہا تھا کہہ رہا تھا تمھاری بیٹی کو اپنی ، لیزے؟" اقبال حمید اسے آوازیں دیتے رہے مگر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی جا کر اپنے کمرے میں بند ہوئی تھی۔ اسے

کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا تڑپ تڑپ کر روتے اپنا سر پکڑ لیا۔۔

اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے میر ہادی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بڑا جذباتی سا منظر تھا۔ شامیر کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ عجیب سے خوبصورت ترین احساسات تھے۔ زارون نے اپنے چھوٹے ہاتھوں سے میرے ہادی کے چہرے کو چھوا۔ جب تک ہادی اس سے ملا نہیں تھا تب تک اسے صبر تھا۔ لیکن اب اس ننھی

سی جان کو گود میں اٹھائے اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی اولاد کے بغیر ایک پل بھی نہیں جی پائے گا۔۔ زارون نے بھی باپ کی گود میں ذرا سی بھی اجنبیت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ اس کی گھنی مونچھوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں میں بھر رہا تھا۔ ہادی نے اسے گدگدایا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

مجھے لگتا ہے سنکی بڈھے نے بھابھی کو بتایا ہی" نہیں کہ آپ انھیں لینے گئے تھے ابھی میں نے بتایا تو بھابھی کافی صدمے میں لگ رہی تھیں۔" شامیر

نے اسے بتانا ضروری سمجھا تھا مگر وہ زارون میں یوں مگن تھا جیسے اسے کسی بات کی پرواہ ہی ناں ہو۔

شامیر نے ایک سرد سانس اپنے اندر کھینچی۔ اس اونٹ نے کسی کروٹ نہیں بیٹھنا۔ دو گھنٹے زارون کو اپنے پاس رکھنے کے بعد شامیر نے اسے اندر پکڑایا اور وہاں سے چلے گئے۔

پھر وہ روز دو تین گھنٹے کے لیے یونہی زارون سے ملنے آتے رہے تھے۔

وہ باقاعدگی سے آفس آ رہی تھی۔ پورا ہفتہ ہو چکا تھا۔ راوی نے چین ہی چین لکھا۔ اسے سکون ہی رہا کیونکہ میر ہادی نے اسے آفس میں ایک مرتبہ بھی مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ آفس کی سیکنڈ شفٹ میں کام کر رہی تھی شام چار سے رات نو بجے تک۔ اسی لیے وہ پھر سے اپنی روٹین کے مطابق کام کر رہی تھی۔ لیکن پھر ایک ہفتے بعد اس پرسکون سی جھیل میں چھوٹے چھوٹے کنکر گرنے لگے۔ کبھی اس کی

بنائی پرفیکٹ فائل بار بار ریجیکٹ ہوتی۔ کبھی دو تین فایل پر اکٹھا کام کرنے کو دے دیا جاتا۔ کبھی اوور ٹائم کرنے پر فورس کیا جاتا تو کبھی اس کے کیبن سے فائلز ہی غائب ہو جاتیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ اب بھی پیون نے دو چار اکٹھی فائل لا کر اس کے میز پر رکھی تھیں۔

"بیٹی، یہ سر نے کہا ہے ابھی درست کر کے دیں۔" پیون کہہ کر چلا گیا لیکن لویزا کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ابھی یا آر یا پار والی بات تھی وہ فائلز اٹھا

کر شعلہ جوالہ بنی اس کے کمرے تک آئی تھی۔ زیان صاحب فرسٹ فلور کے آفس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ دروازے پر دستک دے کر وہ دندناتی آفس میں داخل ہوئی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ پر جھکا ہوا تھا۔ چونک کر اس کی جانب دیکھا جس نے فائلیں لا کر پٹخنے والے انداز میں ٹیبل پر رکھیں تو میر ہادی کے ماتھے پر بلوں کا جال سا بچھ گیا۔

فائنلی۔ اس کی کوششیں رنگ لے ہی آئیں۔ وہ جو اسے پوری طرح نظر انداز کیے ہوئے تھی میر ہادی اسے

خود تک لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ سامنے سے آ کر اسے پہلے مخاطب کرے۔

کیوں کر رہے ہیں آپ یہ سب۔" وہ بہت بری طرح" تپی ہوئی تھی۔ میر ہادی نے اسے بغور دیکھا جو سیاہ شلوار قمیض میں سیاہ دوپٹہ نفاست سے سر پر جمائے ہوئے آسمان سے اتری کوئی نازک سی پری لگ رہی تھی۔ میر ہادی کے پیاسے گلے میں گٹھلی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔

"کیا کر رہا ہوں میں ، باس ہونے کے ناطے آپ کو کام دیا ہے، نہیں ہوتا آپ سے۔" وہ صاف اسے چڑا رہا تھا لیوا کے تو گویا تلوؤں سے لگی سر پر بجھی تھی۔

"میں نے یہ ڈیٹا بہت محنت سے کلیکٹ کیا ہے، آپ مجھے بتائیں اس میں کیا غلطی ہے۔"

"میں انھیں خود دیکھ لوں گا، آپ ابھی جائیں اور گودام کی چیکنگ کر کے مجھے پروڈکشن کی ساری رپورٹ بنا کر لا کر دیں۔" میر ہادی نے لاپروائی سے کہا تھا مگر لویزا کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

سر یہ میرا کام نہیں ہے۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر" دانت پیس کر بولی تھی۔

یہ میں طے کروں گا کہ آپ کا کیا کام ہے کیا" نہیں پرسنل اسسٹنٹ صاحبہ۔" وہ بھی طنزیہ لب و لہجے میں بولا تھا۔ مگر لویزا کے سارے فیوز اڑ گئے تھے۔

گودام یہاں سے کافی دور اور ویرانے میں ہے وہ" بہت ڈینجرس ایریا ہے، میں وہاں کیسے جا سکتی ہوں سر۔" لویزا کا چہرہ غصے سے تانبے کی طرح تپنے لگا تھا

سمجھ نا آئی مقابل آدمی اس سے کس جنم کا بدلا لے رہا ہے۔

کافی اچھا بہانہ ہے کام سے بچنے کا، کام چوری کا" فل پروف بہانہ۔" اس نے بڑے ہی کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔

میں جا رہی ہوں۔" وہ کہتی تن فن کرتی وہاں سے" نکل گئی تھی۔ میر ہادی نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ دل تھا کہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہونے کو تیار تھا۔ جسم و جاں اس

کے فراق میں جھلس رہے تھے۔ مگر اپنی جھوٹی انا کے قلعہ کا الم بھی تو سر بلند رکھنا تھا چاہے اسے کرنے میں جان لبوں پر کیوں نا آ جائے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی جب زیان صاحب آفس میں فون کان سے لگائے پریشان حال سا داخل ہوا تھا۔ اس نے فون رکھا اور میر ہادی کی جانب متوجہ ہوا۔

میر ہادی آپ نے لویزا کو گودام بھیجا ہے؟" زیان" اب اس سے باز پرس کر رہا تھا۔

جی۔" اس نے لاپروائی سے کہا زیان نے اپنا ماتھا مسلا۔

"لیکن وہ اس کا کام نہیں تھا میر ہادی۔" وہ بے حد پریشان نظر آرہے تھے۔ میر ہادی کے ماتھے پر بلوں کا جال سا بچھ گیا۔

"یہ میں طے کروں گا کون کیا کام کرے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کو اندازہ بھی ہے میر ہادی آپ نے اسے کتنی
بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے، گودام کے آس پاس
ایک گروہ کافی سر گرم عمل ہے، اب تک وہاں آس
پاس کی دو بچیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی ہو چکی
ہے، اور آج تک کوئی پکڑا نہیں گیا، گودام بھی اسی
ایریا میں ہے، وہاں دن کے وقت کوئی خاتون نہیں
جاتی اور اب تو پھر مغرب کے بعد کا وقت ہو گیا ہے،
اس کا فون آیا تھا مجھے بولا ہے کہ میرے ساتھ کچھ
بھی ہوا اس کے ذمے دار رانا میر ہادی ہو گا۔"

زیان کے منہ سے نکلنے والے جملے لفظ نہیں تھے پگھلا ہوا سیسہ تھے جو میر ہادی کے کانوں میں انڈیلے گئے تھے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنا فون اٹھائے کرسی سے اٹھا اور باہر کی جانب لپکا تھا۔

میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے، پروٹیکشن کے" لئے۔"زیان نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ مگر اسے سنائی کب دے رہا تھا۔ وہ بجلی کی سی رفتار سے باہر بھاگا تھا۔

وہ گودام کے کافی قریب تھی۔ جب ایک دھماکے کی آواز آئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی کیونکہ گاڑی بری طرح ہچکولے کھاتی سڑک کے کنارے لگے درخت سے ٹکراتی بند ہوئی تھی۔ لویزا کو اندازہ ہوا۔ گاڑی کے ٹائر پھٹ چکے تھے اور یہ کوئی اچھا سائن نہیں تھا وہ یقینا بری طرح ٹریپ ہوچکی تھی۔ یہ سڑک پر جان بوجھ کر کیلیں بچھا کر کیا گیا ہوگا۔ لویزا نے گاڑی کے دروازے لاکڈ ہی رکھے اور حاضر دماغی سے کام لیتی گاڑی سے باہر نا نکلی۔ وہ زیان کو ساتھ

ساتھ میسج ٹائپ کر کے بھیجے گئی۔ جب شکار گاڑی سے باہر نا نکلا تو وہ مکروہ چہرے لیے چھ سے سات لڑکے بے ہنگم غلیظ قہقہے لگاتے گاڑی کے ارد گرد منڈلانے لگے۔ لویزا نے جلدی سے ڈیش بورڈ کھولا جس میں اس کی چھوٹی سی پسٹل پڑی تھی۔ اس نے وہ نکالی تو اس میں صرف چار گولیاں تھیں۔

اے کبوتری، جلدی سے باہر نکل، آج تیری کڑاہی'' کھانے میں بہت مزا آنے والا ہے۔' وہ جنگلیوں کی طرح گاڑی باہر سے پیٹتے اسے ہراساں کرنے کی

کوشش کر رہے تھے۔ جب وہ کافی دیر ان کے

مغلظات بکنے کے باجود گاڑی سے باہر نا نکلی تو ان

میں سے ایک نے ایک من وزنی پتھر اٹھایا۔ لویزا کا دم

نکل گیا۔ اس ہلکاؤ زدہ کتے نے وہ پتھر ایک دھما کے

سے گاڑی کے پچھلے شیشے پر پھوڑا تو لویزا کے منہ سے

ایک چیخ نکل گئی۔ شیشے کے ٹکڑے اس کے بائیں

کندھے اور سر میں لگے تھے۔ وہ سب پیچھے سے گاڑی

پر پل پڑے تو لویزا تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی۔ اور

نشانہ سادھ کر ایک لڑکے کو گولی مار دی ایسے ہلکاؤ زدہ

کتوں کو گولی مارنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ وہ رکی نہیں تھی۔ چار گولیوں سے وہ چار لڑکوں کے سینوں پر مختلف جگہ گولیاں مار کر زخمی کر چکی تھی۔ تین گاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ لویزا وہاں سے الٹے پیر بھاگی تھی۔ ادھر ان باقیوں کو بھی پتہ چل چکا تھا کہ لڑکی کی پسٹل میں گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ اس کے پیچھے لپکے تھے۔ لویزا بھاگتے ہوئے گودام میں گھس آئی تھی جو بلکل خالی پڑا تھا۔ وہ ایک محفوظ سی جگہ دیکھ کر وہاں چھپ گئی تھی۔ ہ لڑکے اسے غلیظ گالیاں

دے رہے تھے۔ گندی گندی باتیں کرتے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ لویزا کے آنسو اتنی روانی سے بہہ رہے تھے کہ گال بھگو کر گردن پر بہنے لگے تھے۔ اپنے لبوں پر سختی سے ہاتھ جما کر وہ اپنی سسکیاں دبا رہی تھی جب لبوں سے دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے آگے پڑے کاٹن ایک درندے نے پاؤں کی دھماکے دار ضرب مار کر دور اچھالے تھے۔

لو مل گئی، بہت مزا آیا، آسان شکار میں کہاں مزا آتا ہے۔" جو اس کے سر پر کھڑا تھا وہ خباثت سے بولا۔

وہ تینوں اس کی جانب بڑھنے لگے۔ لویزا کھڑکی سے باہر ایک چہرہ دیکھتے خود ہی نکل کر باہر آئی۔

"تم درندوں سے کوئی گلہ نہیں لیکن شاید میرا شوہر مجھے بے آبرو کروانا چاہتا ہے تبھی تو خود ہی یہاں بھیج دیا۔" وہ لہجے میں زہر لیے چلا کر بولی تھی۔ وہ تینوں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ابھی اسے چھو لیتا جب فضا میں کان پھاڑ فائر کی آواز آئی اور اس شیطان کا ہاتھ چیخ کر بازو کے ساتھ لٹک گیا۔ لویزا نے اپنے کان بند کیے تھے۔ یکے بعد

دیگرے تین چار فائر ہوئے تھے اور وہ تینوں کٹے بکروں کی طرح زمین پر لہو میں نہائے تڑپنے لگے۔ پولیس اور کچھ سیاہ نقاب پوش وہاں تیزی سے پھیل گئے تھے جبکہ رانا میر ہادی جو اس کی گوہر افشانی سن چکا تھا لال بھبھوکا اور کھو چھلکاتی نگاہیں لیے اس تک لپکا اور اسے کلائی سے تھام کر اپنے ساتھ گھسیٹے باہر نکلنے لگا جو پہلے ہی شدت سے رو رہی تھی۔کندھے اور ماتھے کے زخموں سے خون رس رہا تھا۔

چھوڑیں مجھے، اب کیا لینے آئے تھے یہاں؟ میری بے بسی کا تماشہ دیکھنے؟ یا مجھے بے آبرو ہوتے۔"

"شٹ اپ۔" وہ یوں دھاڑا تھا کہ لگا گلے میں خراشیں پڑ گئیں تھیں۔ ادھر وہ اس سے زیادہ ضبط نہیں کر پائی تھی۔ تبھی میر ہادی نے بوکھلا کر اسے سنبھالا تھا جو بہادری سے لڑتی اب اس ہرجائی کو اپنے سامنے پاتے اپنے ہوش گنوا بیٹھی تھی۔

لیزا۔" میر ہادی نے تڑپ کر اسے پکارا۔ مگر وہ سن کب رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی گاڑی میں ڈالا اور تیزی سے وہاں سے لیے نکلا تھا۔

بھاری ہوتے سر کے ساتھ جب لویزا کو آنکھ کھلی تو وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر محو استراحت تھی جبکہ نانو اس کے سرہانے بیٹھی اس پر آیات پڑھ کر پھونک ماری رہی تھی۔ اس کے سر اور کندھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ زارون پاس ہی اس کی آغوش میں سویا ہوا

تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی (کیونکہ نانو کو زیادہ پریشان نہیں کر سکتی تھی)

مجھے یہاں کون چھوڑ کر گیا نانو۔" اس نے بے تاثر" لہجے میں پوچھا تھا۔

تمھارا شوہر۔" نانو نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ اپنے" لب بھینچ کر رہ گئی۔

آخر تم لوگ اس مسئلے کا کوئی حل نکال کیوں نہیں" لیتے۔" نانو اس کی گوشمالی کرنے بیٹھ گئیں تو لویزا

نے کراہ سی بھری۔ وہ کچھ نہیں بول پائی تھی۔ کیا بولتی؟ چپ چاپ آنکھوں پر بازو رکھے پھر سے لیٹ گئی۔

آپ دعا کرنا نانو، اس مسئلے کا جلد از جلد کوئی حل نکل آئے۔" اس نے یاس بھرے لہجے میں کہا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ آج دو دن کے بعد آفس آئی تھی۔ سب نے اس کی

خیر خیریت پوچھی تھی۔ اس کے ٹیبل پر گیٹ ویل

سون کے کارڈ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی

آفس میں ایک گھنٹہ ہی گزرا تھا جب گھر سے ایک

جان لیوا سی فون کال آئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ

میر ہادی کے کیبن کی طرف بھاگی۔ بغیر دروازا ناک

کیے آفس میں داخل ہوئی تو میر ہادی نے اسے چونک

کر اسے دیکھا۔

"میرے گھر میں ایمرجنسی ہو گئی ہے مجھے ابھی اسی وقت گھر جانا ہوگا۔" اس نے سرد و سپاٹ سے لہجے میں کہا تھا۔

"کہیں نہیں جا سکتی ہیں آپ؟ چپ چاپ اپنے کیبن میں جائیں۔" وہ گویا بھڑک اٹھا۔

"بھاڑ میں جائیں یہ نوکری اور آپ، میں جا رہی ہوں، میرا ریزائن اسی ٹیبل کے دراز میں پڑا ہے۔" وہ کہہ کر نکل گئی اور میر ہادی سانس روکے بند دروازہ دیکھے گیا۔ لیکن اسی لمحے اسے اپنے فون پر شامیر کی کال

آئی جو اس نے بے دلی سے رسیو کی مگر سامنے سے جو سننے کو ملا وہ رانا میر ہادی کی جان نکالنے کو کافی تھا۔

رانا میر ہادی کی رگوں میں اس وقت خون کی بجائے لاوا بہہ رہا تھا۔ وہ دو تین دن سے ہی کانٹوں کے بستر پر لوٹ رہا تھا۔ اس کے منہ سے ادا ہوئے جملے ساری ساری رات اس کے کانوں گونجتے اسے سونے نہیں دیتے تھے۔

تم درندوں سے کوئی گلہ نہیں لیکن شاید میرا شوہر مجھے بے آبرو کروانا چاہتا ہے تبھی تو خود ہی یہاں بھیج دیا۔

اگر وہ اس دن زخمی نا ہوتی تو میر ہادی جانے کیا کر بیٹھتا۔ وہ جتنی دقتوں سے وہاں پہنچا تھا۔ اور پھر اس کی گاڑی کا حشر دیکھ کر اس کا خود کا کیا حشر ہوا تھا یہ تو وہ کسی سے بھی الفاظ میں بیان کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور آج زارون کو چوٹ لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے شامیر نے اسے کال پر بتایا تھا وہ دونوں چونکے آگے پیچھے آفس سے بھاگ کر نیچے آئے تھے تو پارکنگ میں

دونوں کا تصادم ہو گیا تھا۔ وہ اسے اگنور کر کے اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگی۔

میرے ساتھ چلو۔" میر ہادی نے سرد سے لہجے میں کہا تھا۔

ضرورت نہیں، میں چلی جاؤں گی۔" لویزا نے روکھے پن سے کہا تب وہ بے حد جارحیت لیے لویزا کی جانب بڑھا تو لویزا کا دل اچھل کر حلق میں آیا۔ میر ہادی نے اس کی کلائی دبوچی اور اسے اپنی گاڑی کی پیسنجر سیٹ پر پٹخا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

آپ سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو؟" وہ چیخ پڑی۔"

تمھارے بچے کا باپ۔" تسلی بخش جواب تھا لویزا تلملا"

اٹھی۔

جب وہ پندرہ ماہ کا ہو گیا تب یاد آیا ہے آپ کو کہ"

آپ اس کے باپ ہیں۔" غصے سے شاید لویزا کا دماغ

الٹ چکا تھا تبھی جو منہ میں آیا بولے گئی۔

اس کی ماں اسے اس کے باپ سے چھپا کر نہیں"

بھاگتی تو بہت پہلے یاد آجاتا۔" وہ گاڑی چلاتا بڑے

تحمل سے جواب دے رہا تھا مگر لہجہ بلا کا زہر آلود تھا کہ لویزا کی رگیں نیلی۔ہونے لگیں۔

"وہ میری کوکھ میں تھا تب اس کا باپ مجھے طلاق دینے کی بات کر رہا تھا۔" اسے بھی ادھر رکھنا کب آتا تھا تبھی الگ کر بولی تھی۔

"ہاں کیونکہ اس کی ماں ایک بہت بڑی دھوکے باز تھی، اس کے باپ کو اپنے من پسند کھولنے کی طرح استعمال کرتی رہی۔" اسے زخموں پر نمک پاشی کرنا خوب آتی تھی۔ لویزا کا چہرہ ضبط کی شدت سے لہو

چھلکانے لگا۔ گلے میں پھندا سا لگ گیا تو وہ کچھ بول

نہیں پائی تھی اس بے حس انا پرست شخص کے

سامنے اپنے آنسو اب بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی سو

بے رخی اپناتے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میر

ہادی کے لبوں کو ایک زخمی سی مسکراہٹ چھو گئی۔

وہ دونوں گھر ہی آئے تھے۔

کیونکہ جب زارون تیسری سیڑھی سے پھسل کر گرا تب

اتفاق سے شامیر اسے ملنے آیا تھا۔ اسے چوٹ لگی تو وہ

اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگا تھا۔ صد شکر کے

چوٹ گہری نہیں تھی۔ وہ اس کی پٹی کروا کر اور میڈیسن کے کر گھر واپس آ گیا تھا۔

لویزا اور میر ہادی آگے پیچھے گاڑی سے نکل کر اندر کی جانب بھاگے تھے۔ لاونج میں شامیر اسے گود میں لیے بیٹھا تھا۔ لویزا نے لپک کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ اور ڈھیر سارا پیار کیا۔

اسے مجھے دو۔" میر ہادی تڑپ رہا تھا اسی لیے لویزا کو" مخاطب کرنا پڑا لیکن وہ تو آگ کے ڈھیر پر بیٹھی تھی حلق کے بل چلا اٹھی۔

"آپ کے بقول میں تو ایک آوارہ اور بدکردار لڑکی تھی تو آپ سے کس نے کہا یہ آپ کا بیٹا ہے، بلکہ آپ کے نکاح میں ہوتے ہوئے میں نے۔"

"شٹ اپ، اپنی یہ گھٹیا بکواس بند کرو، اس سے پہلے میرا ہاتھ اٹھا جائے، خبردار میرے بیٹے کے بارے میں کوئی گھٹیا بکواس کی لویزا میر ہادی میں بلکل برداشت نہیں کروں گا۔"

لویزا کی بات پر جہاں نانو بھونچکا سی اسے دیکھ کر رہ گئیں وہاں میر ہادی یوں گرجا تھا کہ جیسے وقت بھی

سہم کر تھم گیا۔ میر ہادی نے زارون کو اس کی گود سے چھین لیا تھا۔

نانو نے ہی آگے بڑھ کر لویزا کو ایک جھانپڑ رسید کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی بے یقین آنکھیں لیے اپنی نانو کو دیکھے گئی جنھیں زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے غیض و غضب میں دیکھا تھا۔

پاگل ہو گئی ہو؟ کوئی ہوش مند بیوی اپنے شوہر" کے سامنے اتنی گھٹیا باتیں نہیں کرتی، میں نے تمھاری یہ تربیت تو نا کی تھی لویزا، کیوں اپنے شوہر کو خود سے

بدظن کرنا چاہتی ہو؟ کیوں اپنے ہی بیٹے کو گالی دے رہی ہو۔" نانو نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تو وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میر ہادی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور زارون کو لے کر باہر نکل گیا۔ ا کے پیچھے زارون بھی چلا گیا تھا۔

وہ دیر تک روتی رہی۔ نانو ناراض ہو کر اپنے کمرے میں نظر بند ہو گئیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں شامیر اندر آیا تھا۔

"بھابھی، میں آپ کو لینے آیا ہوں، چلیں حویلی اپنے گھر چلیں"۔

"میں کس حثیت سے آؤں شامیر، مجھے صرف اتنا بتا دو"۔

"زاروں کی ماں کی حیثیت سے بھابھی، کیونکہ بھائی اب زاروں کو یہاں نہیں چھوڑنا چاہتے وہ اسے حویلی اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔" شامیر نے کہا تو لویزا نے زخمی سی سرخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

اس کا مطلب وہ زارون کو ساتھ لے جانا چاہتے" ہیں، میری انھیں کوئی ضرورت نہیں شامیر۔" اس کے سسکتے لہجے میں ٹوٹے مان کی کرچیاں تھیں۔

اگر آپ کی ضرورت نا ہوتی تو وہ تب کیوں واپس لینے" آتے آپ کو۔" شامیر نے زچ ہوتے ہوئے بے بسی سے کہا تھا۔

وہ مجھے طلاق دینے والے تھے شامیر۔" لویزا ہسٹریائی" انداز میں چیخی۔

"لیکن دی نہیں بھابی، آپ کو اتنی سی بات سمجھ نہیں آئی کہ وہ صرف آپ کو تکلیف دینے کو اس وقت وہ ساری باتیں کر رہے تھے، تازہ تازہ غم و غصہ تھا اس لئے۔" شامیر کا دل کیا دیوار میں سر دے مارے۔

"وہ مجھے اپنی زندگی میں نہیں چاہتے شامیر انھوں نے ایک مرتبہ بھی۔"

"بس کریں بھابھی، یوں تو یہ معاملا کبھی نہیں سلجھے گا جب آپ دونوں ماضی کو ربڑ کی طرح کھینچتے اس میں

اپنا مستقبل الجھاتے رہیں گے، دونوں نے ہی انا کا الم
بلند کر رکھا ہے، کبھی سوچا ہے آپ نے ایک بروکن
فیملی کا حصہ بن کر زارون کا کیا مستقبل بنے گا؟
اسی لیے اب آپ کو ہی اپنے بیٹے کے مستقبل کا
سوچنا پڑے گا، میں آپ کو بھائی کے اگے جھکنے کا
ہرگز نہیں کہہ رہا لیکن اپنے بیٹے کی خاطر بس اپنا
ایک یہ قدم ماضی کی الجھنوں سے نکال کر مستقبل کی
جانب بڑھا لیں، زارون کی خاطر حویلی چلیں، آپ جانتی
ہیں وہ آپ کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا، اسے

اپنے ماں باپ دونوں کی ضرورت ہے، آپ چلیں گی ناں میرے ساتھ۔؟ شامیر نے اپنی سر توڑ کوشش کر لی تھی اب امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

لویزا نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تو شامیر نے سکھ کا سانس لیا۔

آپ اطمینان سے اپنی پیکنگ کر لیں، ہم باہر ہی ہیں، شامیر کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ لویزا نے فون اٹھا کر ایک کال ملائی تھی جو آدھی بیل پر ہی رسیو ہو گئی۔

لیزے، میری بچی میری گڑیا، تم ٹھیک تو ہو؟ سب خیر خیریت ہے ناں؟" اقبال حمید کی آواز میں صدیوں کی تڑپ تھی۔ اس دن سے اس نے اپنے پاپا سے کلام تک نہیں کیا تھا آج اچانک کال ملائی تو اقبال حمید اچنبھے کے ساتھ پریشان ہو گئے تھے کہ اس قدر ناراضگی کے باجود ایسا کیا ہو گیا تھا جو وہ انھیں کال کر رہی تھی۔

تین دن پہلے بھی انھیں اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا جب ان کے فون پر میر ہادی کی کال آئی تھی۔

انھوں نے بادل ناخواستہ کال ریسیو کی لیکن سامنے سے انھیں جو سننے کو ملا وہ ان کے ہوش اڑانے کو کافی تھا۔

"مدد میری بیوی کی جان اور عزت خطرے میں ہے، مدد چاہیے آپ سے، ویسے بھی اگر میری بیوی کو کسی نے ہاتھ بھی لگا دیا تو آج لاشوں کے ڈھیر بچھا دوں گا میں، پھر وہ کچرا بھی آپ کو ہی صاف کرنا ہے۔" اس نے سپاٹ و بے تاثر لہجے میں ان سے مدد مانگی تھی۔ وہ تڑپ ہی تو گئے تھے۔

لوکیشن بھیجو۔" انھوں نے سوال جواب نہیں کیا" تھا۔ بس دو لفظوں میں یقین دہانی کروائی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہیں۔ ان کے جوانوں نے ان درندوں کو جہنم واصل کر دیا تھا جو پہلے ہی دو تین بچیوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنا چکے تھے۔

پاپا میں زارون کو لے کر میر ہادی کے ساتھ جا رہی ہوں، لویزا نے آہستگی سے کہا تو چند پل کے لیے وہ بلکل خاموش تھے۔

ٹھیک ہے جاؤ، اپنا اور بے بی کا بہت زیادہ خیال رکھنا، کوئی بھی مسئلہ ہو تو مجھے کال کرنا، خوش رہو جیتی رہو۔" اقبال حمید کے الفاظ پر لویزا پرسکون ہو کر مسکرائی تھی۔ اقبال حمید نے چند ضروری ہدایات دے کر فون رکھ دیا۔ لویزا نے کا کر نانو کو اطلاع دی تو وہ اپنی تمام تر ناراضگی بھلائے اس کے ساتھ پیکنگ کروانے لگیں۔ آدھے پونے گھنٹے میں اس پیکنگ ہو گئی تھی۔ وہ جب شامیر کے ہمراہ گھر سے باہر نکلی تو میر ہادی پہلے ہی زارون کو لیے گاڑی کی پچھلی سائیڈ

پر براجمان تھا۔ شامیر نے آ کر اس کا سامان ڈگی میں رکھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ لویزا کے لیے اس نے پچھلی جانب کا دروازا کھولا تو لویزا نے پہلو بدلا۔ لیکن پھر ناچار اسے اس شخص کے پہلو میں بیٹھنا پڑا جو بظاہر بے نیاز سا ہوا بیٹھا تھا۔ زارون اسے گاڑی میں دیکھ کر اس کی جانب ہمکنے لگا۔ لویزا نے ہاتھ آگے بڑھائے تو وہ اس کے پاس آ گیا۔ اسے پکڑتے لویزا کے ہاتھ اس کے کشادہ سینے سے ٹکرائے تو لویزا کے تو آسان خطا ہوئے سو ہوئے وہ بھی پہلو بدل کر رہ

گیا۔ لویزا نے جلدی سے زارون کو گود میں لیے اپنا رخ اس سے ذرا سا پھیر لیا تو رانا میر ہادی نے سختی سے اپنا جبڑا بھینچ لیا۔

جب گاڑی حویلی کی طویل و عریض ڈرائیو وے پر رکی تو لویزا اور زارون دونوں سیٹ سے سر ٹکائے سو رہے تھے۔ میر ہادی نے ایک گہری نگاہ اپنے پہلو پر ڈالی جو تقریباً دو سال بعد آباد ہو ہی گیا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے لیے بغیر وہ

حویلی میں تھی احساس برتری کو بڑی تقویت ملی تھی۔

اب بس اسی طرح جیسے وہ اس کی زندگی سے گئی تھی

انھیں پیروں واپس آجاتی تو سب کچھ ٹھیک ہو جانا

تھا۔ ایک مرتبہ اسے بول کر کے ہاں وہ اس کے بغیر

نہیں رہ سکتی تبھی مرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ بولنا

تو لویزا ہی نے تھا ناں۔؟

کیا ہوا جو میر ہادی اس لڑکی کے عشق میں اسی وقت

اپنے دل و جاں سے گرفتار ہو گیا تھا جب پہلی مرتبہ

لویزا نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اسے تو

بعد میں سمجھ آیا وہ اپنی ہی شادی پر کیوں خوش نہیں تھا؟ کیونکہ میر ہادی وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے اپنے جذبات سمجھ نا آئے لیکن اب دو سال سے وہ اپنا محاسبہ ہی تو کیے ہوئے تھا کہ کیوں وہ اس سے ملنے گیا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ اس کی کردار کشی کی اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا یہ تو تب پتہ چلا جب وہ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی جان دینا چاہتی تھی۔ تب اس نے اپنی جان کی پرواہ

کیے بغیر اسے بچا لیا تھا۔ اور پھر بعد میں تو یاداشت
جانے کے بعد ہی سہی وہی سب کچھ ہوا تھا جو وہ چاہتا
تھا۔ جو اس کا دل اس کی روح چاہتی تھی۔ پھر
یاداشت آنے کے بعد وہ انا پرست شخص پھر سے اپنی
آکڑ، خودی ، احساس برتری کے نشے میں چور شخص چاہتا
تھا وہ جھک جائے۔ اور خود سے اس کے ساتھ کی
بھیک مانگے۔ لیکن وہ چلی گئی۔ اور اس کی روح تک
تڑپا گئی۔ اب پھر سے گن گن کر بدلے لینے کی باری
تھی۔ تبھی

وہ گاڑی سے اتر کر چپ چاپ اندر چلا گیا تو شامیر نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

بھابھی۔" شامیر نے عقیدت سے اسے پکارا تو لویزا" کی آنکھ کھلی۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک شاندار بڑی سی پتھروں سے بنی حویلی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو پہلو خالی تھا۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

اندر چلیں؟ زارون کو مجھے پکڑا دیں، آپ کا سامان" ملازم کے آئے گا۔" شامیر نے کہا تو وہ اس کی تقلید

میں اندر آئی جہاں وہ بہت بڑے سے لاونج میں ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا بظاہر فون سکرول کر رہا تھا۔

"شامیر، یہ ابھی اور سوئے گا، کچی نیند اٹھ گیا تو بہت روئے گا۔" لویزا نے اندر آتے شامیر کو آہستگی سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم نے زارون کا روم پہلے ہی تیار کر رکھا ہے بھابھی۔" شامیر اسے لیے لاونج سے اوپر جاتی ایڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آیا۔ وہ ایک دروازا دھکیل کر اندر آئے تو لویزا مسکرا دی۔ وہ روم واقعی زارون کے تیار

کیا گیا تھا جس میں دنیا جہان کے کھولنے اس کا بے بی کاٹ اور زارون کا نیا سامان پڑا تھا۔ وہاں ایک سنگل بیڈ ہی تھا۔

شامیر میرا سامان بھی اسی روم میں منگوا دو۔" لویزا" نے اطمینان سے کہا۔

لیکن بھابھی، زارون کے لیے بھائی نے گورنس کا" انتظام کر رکھا ہے۔" شامیر منمنایا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں شامیر، میں یہاں 'صرف' زارون کے لیے آئی ہوں تو 'صرف' زارون کے پاس ہی رہوں گی، کسی گورنس کی ضرورت نہیں۔" لویزا نے دو ٹوک لہجہ اختیار کیا تو شامیر کا دل کیا اپنا سر پیٹ لے۔

اوکے میں بھیجتا ہوں، بس آپ ریلیکس رہیں۔" وہ" کہہ کر روم سے نکل گیا۔ لویزا نے آہستگی سے زارون کو بے بی کاٹ میں لٹایا۔ ملازمہ اس کا سامان اسی

کمرے میں پہنچا گئی تو وہ اطمینان سے اپنا سوٹ نکالے واش روم چلی گئی تھی۔

وہ زمینوں کے کام سے حویلی سے باہر نکلا تھا اور جان بوجھ کر رات کو ہی واپس لوٹا۔ ایک خوش کن خیال کے تحت ناک کی سیدھ میں اپنے بیڈ روم میں آیا تھا۔ لیکن پھر جب ہمیشہ کی طرح خالی کمرے نے اس کا منہ چڑھایا تو ایک ان دیکھی آگ کے الاؤ میں اس کا تن من سلگ اٹھا۔ کمرے کے بیچ و بیچ کھڑے ہو کر اس

نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑے تھے۔ بے دردی سے جبڑا اور لب بھینچتے سینے مشاٹھنے والے ابال کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ تب اپنے کپڑے لے کر واش روم جا گھسا۔ آدھا گھنٹہ پانی کے نیچے رہنے کے بعد بھی دل میں لگی آگ ٹھنڈی نا ہوئی۔ سیاہ ٹراوزر شرٹ پہنے وہ گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرتا باہر آیا تھا۔

زارون کو تو دیکھ کر آ ہی سکتا ہوں کیا کر رہا ہے؟؟ وہ سوچتے اپنے کمرے سے نکل کر بغیر دستک دیئے ساتھ والے کمرے میں جا گھسا۔ سامنے ہی بیڈ پر وہ بڑے

ریلیکس انداز میں زارون کو اس کی خوراک دے رہی تھی اس کے یوں اندر آنے پر گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور تیزی سے پاس پڑا دوپٹہ اٹھا کر اپنا وجود چھپایا۔ میر ہادی جسے اندازہ نہیں تھا اس طرح کی صورت حال کا بھی سامنا ہو سکتا ہے اپنا لب دانتوں تلے دبایا۔ زارون جو ماں کے پہلو میں گھسا ہوا تھا آہٹ پاتے ہی نکل کر اسے دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

میرا پرنس۔" میر ہادی بول کر قریب گیا۔ اسے گود" میں بھر کر دھپ سے وہیں بیٹھ گیا تو لویزا جسے ہائی

وولٹیج کا جھٹکا لگا تھا اچھل کر پیچھے ہٹی۔ میر ہادی نے ایک گہری سانس بھرتے ایک من پسند خوشبو اپنی سانسوں میں اتری محسوس کی۔ کتنا تڑپا تھا وہ اس لڑکی کے لیے۔ اس کی قربت کے لیے۔ اس کے ساتھ کے لیے۔ اور اس نے اس کے دل و جاں پر اپنی دوری سے اتنا ہی ظلم ڈھائے رکھا۔ اب بھی اس کے بیڈ پر بیٹھنے سے وہ نا محسوس انداز میں ذرا سا پیچھے سرکی تو میر ہادی کا دل کیا ابھی اسی وقت اس کے ہوش ٹھکانے لگا دے۔ اپنی شدت و دیوانگی بھری بلکہ وحشتوں سے

بھری قربت سے اسے ایسے نوازے کے اس کا سانس اس کے سینے میں اٹکا دے۔ لیکن میر ہادی کی ڈکشنری میں زبردستی کرنا یا جھکنا کہاں لکھا تھا۔؟ جیسی آگ اس کے تن من میں لگی تھی وہی آگ وہ اس لڑکی کے سینے میں منتقل کرنے کا ارادا باندھ چکا تھا۔

ادھر وہ اس دراز قامت شخص کا لمبا چوڑا وجود اپنے اتنے قریب محسوس کر اپنے سینے میں اپنی سانس تک اٹکا بیٹھی تھی۔ مردانہ کلون کی مخصوص تیز خوشبو سانسوں میں اتری تو دل دھڑک کر پاگل ہوتا پسلیوں سے

سر ٹکرانے لگا۔ لویزا نے اپنے لب دانتوں تلے کچل ڈالے۔

"میرے پرنس، سو جاؤ، صبح آپ کو بہت بڑا سرپرائز ملے گا۔" وہ کہتا زارون کو بستر پر اتار کر کمرے سے ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔ لویزا کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ یہ شخص پتہ نہیں آخر چاہتا کیا تھا۔ اسے سمجھ نا آئی تبھی سر جھٹکتے زارون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

اگلے دن ہی اس نے پوری حویلی میں دوسری شادی کی تیاریوں کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر جب شامیر لویزا اور زارون بریک فاسٹ کر رہے تھے تب تمام ملازمین کو بلا کر تمام حویلی کی نئے سر سے سیٹنگ اور ڈیکوریشن کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

بہت جلد ہی بخت سردارنی بن کر اس حویلی میں" آنے والی ہیں، اور تم لوگوں کو پتہ ہے اسے ہر چیز پرفیکٹ چاہیے ہوتی ہے، اسی لیے جو جو سیٹنگ بتا رہا ہوں کرتے جاؤ، کل زارون کا عقیقہ ہوگا اور پرسوں

میرا نکاح۔" وہ بول رہا تھا اور شامیر کا دل کر رہا تھا اپنا

سر پھاڑ لے یا اس پاگل آدمی کا جو جانے کیوں اپنی

پرسکون زندگی کو بار بار خود ہی آگ لگا دیا کرتا تھا۔

"بھائی آپ۔"

اس سے پہلے وہ تلملا کر کچھ کہتا۔

نو آرگیو شامیر۔" میر ہادی نے لاپروائی سے کہا۔ لویزا"

جس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا پھر بھی اپنے تاثرات پر قابو

پاتے وہ چپکے سے زاروں کو لیے اپنے کمرے میں آ

گئی۔ میر ہادی کو یہ وار بھی خالی جاتا دکھائی دیا تو اسے پھر سے لگا اس پر کسی نے لاوے کا پہاڑ انڈیل دیا ہے تبھی جلتا بھنتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

لویزا گھرے گھرے سانس بھرتے کمرے میں آئی تھی۔ یہ آدمی اسے جھکانے کو نہایت اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ لویزا نے اس گھڑی کو کوسا تھا جس گھڑی اسے اس پتھر دل، کٹھور اور انا زادے سے محبت ہوئی تھی۔

ایک وار تم نے کیا۔ تو اب اگلا میرا وار سہنے کے لیے تیار رہو رانا میر ہادی۔ دیکھتے جاؤ کس کا وار زیادہ کار گر ثابت ہوتا ہے۔ تم اب جھکو گے بھی اور میرے آگے گھٹنے بھی ٹیک دو گے۔

لویزا نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کرتے خود سے عزم باندھا تھا۔

یہ اگلا دن تھا اور حویلی میں غیر معمولی افراتفری کا عالم تھا۔ میر ہادی اور شامیر نے بہت بڑے پیمانے پر زارون کا عقیقہ کیا تھا۔ پورے گاؤں کے لئے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

وہ آج بے حد دل سے تیار ہوئی تھی۔ سرخ میرون شیڈ کی ساڑھی میں بال کھلے چھوڑ کر ہلکے سے نیچے سے کرل کیے تھے۔ ہلکے میک پر سرخ یاقوت کی نفیس سی جیولری پہنے اس کی تیاری بڑی قیامت خیز تھی۔ ایک کندھے پر ساڑھی کا پلو تھا اور دوسرے پر برینڈڈ شال

اوڑھے وہ زنان خانے میں نانو کے ہمراہ زاروں کو لیے
بیٹھی تھی۔ گاؤں کی خواتین بڑے شوق سے رانا میر
ہادی کی شہری بیوی کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ اس کا نوخیز
حسن اور خوبصورتی دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دبا
لیتیں۔ ملازماؤں نے لویزا کو گھیر رکھا تھا تاکہ اسے کوئی
پریشانی نا ہو۔ وہ بھی بڑے با اعتماد طریقے سے سب کو
ہینڈل کر رہی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ کسی کام
سے اندر آیا تھا۔ ایک انتہائی نازک، نفیس اور دلکش
دلفریب منظر پر نگاہ ٹھہری تو قدم داخلہ دروازے پر جم

سے گئے۔ اسے اتنے عرصے بعد اس طرح یا سنگھار کیے دیکھ رانا میر ہادی کے ہوش پوش اڑ گئے تھے۔ وہاں موجود سب خواتین نے اس کا یوں ٹھٹھک کر پتھر ہو جانا محسوس کیا تو کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔ لویزا جس نے اس کے دل پر کاری وار کرنے کو اتنا سب کچھ کر تو کیا تھا اب اس کی محض نگاہوں کی تپش سے اسے دانتوں تک پسینے چھوٹ گئے تھے۔ خواتین کے ہنسنے پر وہ اپنی ہوش و حواس قائم رکھتا آگے بڑھا اور زارون کو اس کی گود سے لے لیا۔ اس کے دل پر

بجلیاں سی گری تھیں۔ خود کو سنبھالنا مشکل ہوا تو وہ زارون کو لیے پھر سے مردان خانے چلا گیا۔۔ جہاں تقریب میں اقبال حمید نے بھی شرکت کی تھی۔

تقریب بہت اچھے سے اختتام پزیر ہوئی تھی۔ نانو اور اقبال حمید اسے خوش اور مطمئن دیکھ خود بھی مطمئن ہوتے چکے تھے۔ وہ تھکی ہاری زارون کو لیے اس کے کمرے میں آئی مگر بھونچکا رہ گئی۔ کمرے میں زارون اور اس کی کوئی چیز موجود نا تھی۔ وہ پریشان حال سی

(کمرے سے باہر نکلی تو سامنے ہی ملازمہ کھڑی تھی

(شاید اسی پل کے انتظار میں

بیگم صاحبہ ، رانا صاحب نے آپ کا اور بے بی کا"

سارا سامان اپنے کمرے میں شفٹ کروایا ہے، وہ کہہ

رہے تھے آج سے آپ دونوں وہیں رہیں گے۔" ملازمہ

بول کر اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ کر جا چکی

تھی۔ اس کی آج کی وارفتگی اور دیوانگی بھری نگاہیں یاد

کرتے اس کا دل اچھل کر حلق میں آیا تھا۔ چاہتی تو

وہ یہی کچھ تھی کہ وہ متوجہ ہو۔ ایسا ہو جسے نظر انداز

کرنے میں مزا آئے۔ مگر سب تدبیریں الٹی پڑ گئیں کے مصداق وہ خود ایک شیر کی کچھار میں ہاتھ دے بیٹھی تھی۔ مرتے کیا نا کرتے کے مطابق وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے اس شخص کے کمرے تک گئی تھی۔ اس کے کمرے میں اس کے پاس رہ کر اسے نظر انداز کرنا۔ آخر اتنا تو وہ کر ہی سکتی تھی۔ تبھی کچھ پرسکون ہوتے کمرے میں داخل ہوئی۔

میر ہادی کمرے میں اس کا شدت سے منتظر تھا۔
آتشین سے جذبات و احساسات نے اس کے اندر آگ
لگائی ہوئی تھی وہ جل رہا تھا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔
جانتا تھا اس کے قرب کے ٹھنڈے میٹھے چھینٹے اس
کے سینے میں لگی آگ کو بجھا دیں گے۔ جذبوں کی
انتہائی عروج پر تھی۔ ایک عرصے سے اس کو دل و
جاں اس کی انگلیوں میں بسے لویزا میر ہادی کو پھر سے
چھونے کو بیتاب تھے اور آج وہ اپنے ارادوں سے
سمجھوتہ کرنے کو بلکل تیار نہیں تھا۔

وہ تھکا ہارا پہلے ہی کمرے میں موجود تھا اس کا اندازہ لیوا کو بلکل نہیں تھا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اور کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ لویزا نے سوئے ہوئے زارون کو آگے بڑھ کر کاٹ میں لٹایا۔ اور خود بالوں کا میسی سا جوڑا بناتے وارڈروب تک آئی۔ جان تو حلق میں تب اٹکی جب اسے بستر چھوڑتے چپ چاپ اپنی جانب بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ وارڈروب کھول کر اپنے لئے کپڑے نکال رہی تھی جب وہ اس کے پیچھے اس کے بے حد قریب یوں

آن کھڑا ہوا کہ لویزا کی پشت اس کے کشادہ سینے ٹکرا گئی۔ وہ اس سے پہلے کوئی رد عمل دیتی میری ہادی کی آہنی بانہوں نے بڑی شدت سے اس کے گرد اپنا شکنجہ کس لیا تھا۔

مم، میر ہادی۔" لویزا نے گھبرا کر اسے پکارا۔ وہ اس" کی پیش قدمی جھٹک دینا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا کر نہیں پائی تھی۔ شاید وہ بھی خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔ میر ہادی نے نرمی سے اس کا جوڑا پھر سے کھول دیا۔ اس کے بال اس کے چہرے پر

بکھر گئے تو میر ہادی نے اس کے بالوں میں اپنا چہرہ چھپایا تھا۔ وہ بے حد گھبراہٹ کا شکار ہوئی تھی۔ آج اس کے ہر ہر انداز میں عجیب سی جارحیت تھی۔ اس نے خود پر ایک موسم اترتے دیکھا۔ جانے خزاں کا تھا جاڑے یا پھر بہار کا؟ وہ تو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ یہ موسم اس کی جان لینے کے در پر ہوا۔ وہ اس جذبوں کے طوفان سے ٹکرائی اس کی شدت بلکل برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

صبح میر ہادی کی آنکھ کھلی تو وہ اس کے سینے پر سر رکھے گہری نیند میں تھی اس کی زلفیں اس کے سینے پر بکھری ہوئیں تھیں۔ خود کا جھکنا، اپنی بے اختیاری اور اس لڑکی کا اپنے مقصد میں کامیاب ہوجانا یاد آیا تو وہ ایک مرتبہ پھر سے سر تا پیر الگ اٹھا۔ اسے کسمسا کر اٹھتے دیکھ میر ہادی نے بڑی شدت سے اسے خود سے دور پٹخا تھا۔ لویزا جسے لگا تھا ان دونوں کے مابین سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ اب اگلی زندگی پرسکون اور

خوشیوں بھری گزرے گی۔ اس طرح مطلب پورا کرنے کے بعد دھتکار دیا جانا بلکل غیر متوقع تھا۔

رانا میر ہادی۔" وہ اس تزلیل پر بلبلا اٹھی تبھی چلا کر" اسے مخاطب کیا تھا۔

کیا ہوا رات بھر دل نہیں بھرا، توجہ کی اور بھیک" چاہیے؟ وہ سرد و سپاٹ چہرہ لیے بولا تو لویزا کو تو آگ ہی لگ گئی۔

"یہ کس قسم کی بیہودہ گفتگو کر رہے ہیں آپ مجھ سے، میں نے کب کہا مجھے آپ کی توجہ کی بھیک چاہیے؟ وہ بھڑک اٹھی۔

"تو وہ بناؤ سنگھار، یا ادائیں دکھانا وہ کس لیے تھا اگر توجہ نہیں چاہیے تھی تو۔" اس نے اطمینان سے اس کو رگید ڈالا۔ لویزا کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا تھا۔

"آپ کے لیے تو بلکل نہیں تھا، اپنے بیٹے کی خوشی سیلیبریٹ کر رہی تھی میں۔" وہ غرا کر بولی۔ نا چاہتے ہوئے بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔

لیکن مجھے تو ویسا لگا جیسا میں نے کہا، چلو بہرحال میرا" مطلب تو پورا ہوا چاہے ان چاہے وجود سے ہی کیوں نا ہوا ہو۔" اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

اگر میں اتنی ہی ان چاہی ہوں تو آپ کی ہمت کیسے" ہوئی مجھے سڈیوس کرنے کی، مجھے کسی ٹشو پیپر کی طرح یوز کرنے کی۔" لویزا کا بس نا چلا اس شخص کا منہ نوچ لیتی جو کہنے کو اس کا شوہر تھا لیکن اسے جھکانے کو خود بہت نیچے تک گر رہا تھا۔

"تمھارے نام کے ساتھ میرے نام کا دم چھلا لگا ہے،
یعنی اگر مجھے اپنی خواہش جائز اور حلال طریقے سے پوری
کرنی ہے تو تمھارے پاس ہی آنا پڑے گا، اسی لیے۔"
وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے بولا۔ لویزا پر کوئی تیزاب
پھینک دیتا اسے اتنی تکلیف نا ہوتی اسے کوئی بھڑکتے
الاؤ میں پھینک دیتا اسے اتنی تکلیف نا ہوتی۔ آج رانا
میر ہادی نے اس کی نسوانیت اور اس کے پندار پر وار
کیا تھا جسے وہ سہنے کو تیار نا تھی۔

میں اپنی اتنی تزلیل ہر گز برداشت نہیں کروں گی"
میر ہادی۔" اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ میر
ہادی ٹھٹھک گیا۔

بس کچھ دن کرنا پڑے گی، پھر تو میں دوسری شادی"
کر ہی لوں گا، تمھیں اس کے لیے بھی زحمت نہیں
دوں گا۔" وہ پھر بھی وار کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

،اگر ایسا کرنا ہے تو مجھے ابھی اسی وقت آزاد کریں"
طلاق دیں مجھے۔" وہ حلق کے بل چلا اٹھی تو وہ
جانے کیوں مگر لبوں پر تلخی لیے مسکرا دیا تھا۔

تم تو یہاں زارون کے لیے آئی تھی ناں، تو تمھیں کیا"
فرق پڑتا ہے کہ میں کیا کرتا ہوں کیا نہیں۔" وہ پھر
سے طنز کر رہا تھا۔

"زارون کے لیے ہی آئی تھی لیکن جب اسے نئی ماں
مل جائے گی تو میری ضرورت بھی نہیں رہے گی اسی
لیے واپس بھی چلی جاؤں گی۔"

وہ لاجواب ہوا تھا۔ یہ بھی کہاں گوارا تھا کہ لاجواب ہو
جائے تبھی بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر آیا اور اسے
اپنے طریقے سے ان الفاظ پر سزا دی تھی۔ لویز نے

روتھ ہوئے اس کے کشادہ سینے پر بے تحاشا مکے برسائے تھے۔ مگر ادھر فرق کس کو پڑتا تھا۔

"بھول جاؤ بیگم، ہمارے خاندان میں کسی عورت کو مر کر ہی اس کے شوہر سے آزادی ملتی ہے، تمھیں بھی مر کر ہی مجھ سے آزادی ملے گی، رہنا تو تمھیں اب اسی حویلی میں ہے، آئی تھیں اپنی مرضی سے اب رانا میر ہادی کی اسی قید میں رہنا ہے ساری زندگی۔" وہ پھنکار کر کہتا واش روم میں جا گھسا تھا۔

اور پھر (بقول میر ہادی کے) جب وہ تیار شیار ہو کر اپنے نکاح کے لیے جانے لگا تھا یہ وہی لمحہ تھا جب لویزا زارون کو گورنس کے حوالے کیے اپنا لگیج گھسیٹتی کمرے سے باہر نکل کر لاونج تک پہنچی تھی۔ وہ اسی وقت اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

کہاں جا رہی ہو؟" اس کا غضبناک لہجہ لویزا کو متاثر نا کر سکا ۔ نظر انداز کر کے وہاں سے نکلنا چاہا جب رانا میر ہادی نے اس کی کلائی پکڑی اور اسے ساتھ

گھسیٹتے اوپر لے جانے لگا۔ لویزا کے لاکھ ہنگامہ مچانے کے باجود میر ہادی نے اسے لا کر اپنے بستر پر پٹخا تھا۔

لگتا ہے رات تمھاری عقل ٹھکانے نہیں آئی، پر اب" ضرور آ جائے گی۔" وہ کہتا اس کے قریب جانے لگا جب وہ چکنی مٹی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔

خبردار، مجھے چھونے کی کوشش بھی کی، اپنا آپ ختم" کر لوں گی میں میر ہادی۔" وہ بے تحاشا روتے ہوئے چلا کر بولی تھی۔ وہ تلخی سے ہنس دیا۔

کمال ہے پہلے میرے قرب کے لیے مرنے کو تیار" تھیں اب جب اپنی قربت بخش رہا ہوں تو میرے چھونے سے مرنا چاہتی ہو؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟" وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے سے بھی آگ لگا دینے کا ہنر رکھتا تھا۔ لویزا جان گئی تھی۔

"وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی سمجھے آپ۔" وہ لرزتی کانپتی بولی تھی۔ آنسو تواتر سے گال بھگو رہے تھے۔ میر ہادی نے لہو چھلکاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میری دوسری شادی سے تمھیں آخر اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے۔" وہ اپنے مطلب کے سوال پر آیا۔

"نہیں ہو رہی اسی لیے تو آپ کو دوسری کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہوں تو جانے کیوں نہیں دیتے۔" لویزا کا لہجہ انتہائی متنفر تھا جو میر ہادی کو بری طرح سلگا گیا۔

"اگر تکلیف نہیں تو اسی لئے تو کہہ رہا ہوں اپنی آنکھوں سے مجھے دوسری کا ہوتے دیکھو۔" وہ انتہائی سفاکیت پر اتر آیا۔

آخری مرتبہ آپ سے کہہ رہی ہوں اگر آپ نے میرا"
مان توڑ کر آج یہ قدم اٹھایا تو مجھے یہاں روک کر
دکھائیے گا، پاپا کو کی گئی ایک فون کال مجھے یہاں سے
ایسے غائب کر دے گی جیسے میں آپ کی زندگی میں
تھی ہی نہیں، یہ بات تو اچھے سے جانتے ہیں ناں
آپ؟" اس کے لہجے میں چیلنج تھا، غرور اور کھلے عام
جنگ کا اعلان۔ میر ہادی نے سر اثبات میں ہلایا۔
"ٹھیک ہے مجھے روک کر یا یہاں سے جا کر دکھانا۔"
میر ہادی نے آگے بڑھ کر اس کا موبائل اپنی جیب

میں ڈالا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔

مطلب رانا میر ہادی نے اس کا مان غرور اور محبت اپنے پیروں تلے کچل ہی دی تھی۔

حویلی کے سارے لینڈ لائن فون ڈیڈ کر دیئے گئے تھے۔ اسے کوئی ملازمہ فون نہیں دے رہی تھی۔ اسے حویلی کے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میر ہادی

نے آج اپنی من مانی کی تھی۔ نکاح بھی کر لیا تھا۔ اور اسے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ رات کو وہ سرشار سا ایک فاتح جرنیل کی طرح کمرے میں آیا تھا۔ وہ زارون کو گود میں اپنے پہلو میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے سرد و سپاٹ چہرہ پر ایک بھرپور نظر ڈال کر وہ اس کے پہلو میں نیم دراز ہو گیا۔ لویزا نے اپنا رخ بدلا اور اس سے لمحہ بہ لمحہ نزدیکی بڑھاتے میر ہادی اور اپنے بیچ زارون کو لٹا دیا۔ میر ہادی نے اپنا لب دانتوں تلے

دبائے زارون کو اٹھا کر کاٹ میں لٹایا اور خود پھر سے آ کر لویزا کے قریب نیم دراز ہوا۔

میرے قریب آو لیزا۔" لہجہ بڑا تحکمانہ قسم کا تھا۔ لویزا" نے اپنے جبڑے اور لب بری طرح بھینچے۔

جس سے نکاح کیا ہے اس کے پاس جائیں۔" وہ" سرد و سپاٹ لہجے میں بولی۔

اسی کے پاس آیا ہوں۔" اس کا اطمینان قابل دید" تھا۔

جس سے دوسرا نکاح کیا ہے۔" وہ پھنکار کر بولی تو"

وہ گہرا مسکرایا۔

اس کے ابھی کچھ ضروری کام پینڈنگ ہیں، وہ ابھی"

رخصتی نہیں دے رہی تو۔" بڑی معصومیت سے اس

نے اپنی مجبوری اور مسئلہ اس کے آگے رکھا تھا۔

تو پھر آپ چلے جائیں اس کے پاس۔" اس نے"

گہرے کاٹ دار لہجے میں کہا تھا۔ مگر وہ اچھی طرح

جانتی تھی مقابل چکنا گھڑا ہے۔ اس پر کسی جلی کٹی

کا اثر نہیں ہونا۔

تم تو جانتی ہوں، کتنا مشرقی قسم کا شرمیلا سا لڑکا"

ہوں میں، رخصتی سے پہلے بیوی سے ملنے جاؤں گا تو

مجھے شرم آئے گی۔" وہ بظاہر سنجیدہ تھا مگر لہجہ بے حد

شرارتی۔ لویزا خواہ مخواہ جل کر خاک ہو گئی۔

بات وہ کریں جس سے اگلے بندے کا ہاضمہ خراب نا"

ہو۔" وہ لفظ چبا کر بولی تو وہ ہنس دیا تھا۔

چلو وہ بات کر لیتے ہیں جس سے اگلے بندے کی"

نیت اور دل خراب ہو جائے۔" وہ نہایت ذومعنی انداز

میں بولتا ایسی نگاہوں سے اس کے نازک وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھا کہ لویزا خواہ مخواہ پانی پانی ہو گئی۔

"میں آپ سے کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ بے حد تپی ہوئی تھی۔

میر ہادی اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔ جیسے کہنا چاہتا ہو۔ یاد کرو۔ یاد نہیں۔ یہ میری محبت کا ہی ایک انداز ہے۔ تمھیں سمجھ نہیں آ رہا پہلے کی طرح تمھیں تپا کر تمھارا غصہ تمھاری جھنجھلاہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ

تمھاری ایسی ادائیں ہیں جن پر صدقے چلے جانے کا

دل کرتا ہے رانا میر ہادی کا۔

بحث کرنا ہے بھی بورنگ، تم پہلے کی طرح بس مجھ"

سے محبت کر لو۔" میر ہادی نے ہاتھ آگے بڑھا کر

اسے اپنی جانب کھینچا تو وہ کٹی ڈال کی طرح اس کے

سینے پر آن پڑی۔

چھوڑیں مجھے، خبردار ہاتھ لگایا، دور ہٹیں۔" وہ گھٹی"

گھٹی آواز میں چلائی تھی۔

بس ایک یہی بات نہیں مان سکتا باقی جو بات منوانا" چاہتی ہو منوا لو۔" میر ہادی کا لہجہ خود بخود شمار آلود ہوا تھا۔

میرا فون مجھے واپس کریں۔" وہ تڑخ کر بولی۔"

اس کے علاؤہ۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کے ہاتھ" بے باک قسم کی گستاخیوں پر اتر آئے۔

مجھے پاپا کے پاس جانے دیں۔" بے بسی کی انتہا تھی"

وہ اس کی باہوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی تبھی لب بری

طرح بھینچ لیے۔

اس کے علاوہ۔" میر ہادی نے اس کی گردن میں"

اپنا چہرہ چھپایا تھا۔

آپ آخر کس بات کا بدلا لے رہے ہیں مجھ ۔" ضبط"

کا باندھ ٹوٹ گیا۔ وہ بلک بلک کر روتی اس کے

کندھے پر مکے برسا گئی۔ میر ہادی نے اسے اپنے سینے

میں بھینچا تھا۔ مگر تواتر سے گرتے آنسوؤں سے اس کی شرٹ بھیگ گئی تو وہ شرافت سے دور ہٹا۔

''سو جاؤ لیزا، آرام کرو۔'' نہیں پریشان کرتا تمھیں۔''

اس نے نرمی سے کہا لویزا اس سے رخ موڑ کر ج کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ لویزا کو لگا میر ہادی کے ہاتھ کسی مسیحا کے ہاتھ ہے جو اس کے تمام زخموں کی مسیحائی کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کی قربت

میں انتہائی نرمی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ اب کسی
خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مگر پھر بھی
بے بس تھی کہ چاہ کر بھی اس کے جان لیوا جادوئی
حصار سے آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دوپہر کو پریشان حال سا کمرے میں آیا تھا۔ آکر اسے
بازو سے پکڑ کر اپنے روبرو کیا۔

تم نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا صبح بریک فاسٹ" نہیں کیا؟ کیا پرابلم ہے؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟" میر ہادی بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔ لویزا کو لگا تھا وہ پوری طرح اس سے انجان اور لاپرواہ ہے مگر غلط ثابت ہونے پر بے تاثر چہرہ لیے اس کی جانب دیکھے گئی۔

لیزا میری بات کا جواب دو۔" وہ اس سے سر کھپاتا" رہا مگر اس نے نا بولنا تھا نا بولی۔ ایک جامد خاموشی خود پر اوڑھ لی۔ نا کچھ بولتی نا کچھ کھاتی تھی۔ اور اس کی

اس روش پر میر ہادی بری طرح جھنجھلایا، جھٹپٹایا، بے تحاشا پریشان ہوا مگر اس کے لاکھ سر پٹخنے اور کوششوں کے باجود وہ اپنی ضد سے ایک انچ بھی ٹس سے مس نا ہوئی۔

شامیر نے جان بوجھ کر اس سب سے میاں بیوی کی آپسی چپقلش سے پوری طرح لاتعلقی اختیار کیے رکھی وہ چاہتا تھا وہ آپس کے مسئلے مسائل اب کی بار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلجھا لیں۔

آج تیسرا دن تھا۔ زارون کو تیار کر کے وہ اس کا پیٹ پوری طرح بھر کر اسے سلا چکی تھی۔ لویزا اس کا فیڈر لیے کچن کی جانب گئی۔ جب لاونج میں پہنچتے تیورا کر زمین بوس ہوئی بلکہ زمین پر گرتے اس کا سر پاس پڑے ٹیبل سے ٹکرایا تو ماتھے سے خون کی لکیر گال پر بہہ گئی۔ میر ہادی جسے کہیں بھی سکون نا تھا جو ابھی ابھی باہر سے لاونج میں داخل ہوا تھا سامنے کا منظر دیکھ کلیجہ منہ کو آیا تو بھاگ کر اسے باہوں میں بھرا۔ وہ اسے کمرے میں لایا۔ لویزا کا سر بے تحاشا کمزوری

کے باعث بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ غنودگی میں بری طرح کراہی۔ میر ہادی نے پوری حویلی سر پر اٹھالی۔ ملازمہ فرسٹ ایڈ باکس لائیو تو میر ہادی نے اس کی پٹی کی۔ وہ جانتا تھا ڈاکٹر کو بلانے کا کوئی فایدہ نہیں۔ یہ جو تین دن سے اس نے کچھ کھایا نہیں تھا اس کی وجہ سے اسے صرف شدید کمزوری تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میر ہادی کی روح تک تڑپ اٹھی تھی۔

لویزا کی ضد اور پھر خود اذیتی کا یہ عالم آخر کار وہ لمحہ آن پہنچا جب رانا میر ہادی جیسے انا پرست کو جھک جانا

پڑا۔ اپنی شکست فاش اس نے دل وجان سے قبول کی۔ میر ہادی کو آج پتہ چلا تھا اسے اپنی انا ،ضد، آکڑ اور ہر ہٹ دھرمی سے زیادہ اپنی اکلوتی پہلی اور آخری محبت عزیز ہے۔

ملازمہ میر ہادی کے حکم پر کھانے کی ٹرے اس کے کمرے میں تھما گئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز چہرے پر سرد و سپاٹ تاثر سجائے لیٹی ہوئی تھی۔ میر ہادی اس کے پہلو میں بیٹھا۔ ایک نوالہ بنایا اور اس کے منہ تک لے کر گیا۔

لویزا کھانا کھاؤ یار۔" میر ہادی نے اسے کہا تو وہ تا"

سے مس نا ہوئی۔

میرا کوئی نکاح وکاح نہیں ہوا بخت سے، اس دن"

بس اس کے نکاح میں شرکت کرنے گیا تھا جو میرے

دوست عالی سے ہوا ہے۔" میر ہادی نے آہستگی سے

بتایا تو آخر کار پتھر کی مورت میں ہلچل ہوئی اس نے

بے یقینی سے میر ہادی کی جانب دیکھا۔

زارون کی قسم، سچ بول رہا ہوں۔" میر ہادی نے کہا تو"

آخر کار لویزا نے لہو چھلکاتی سرخ نم آنکھیں لیے اپنا

منہ کھولا اور نوالے کو شرفِ قبولیت بخش ہی دی۔

ہادی نے سکھ کا سانس لیا۔

اس دن بھی بکواس کر رہا تھا کہ تم ان چاہی ہو یا"

میں صرف اپنی خواہش پوری کر رہا ہوں، تم سے تو میں

نے تب سے عشق کیا تھا جب تم نے پہلی مرتبہ مجھ

سے اظہار محبت کیا تھا ہاں مگر انا پرست تھا ماننے میں

دیر کر دی، لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم

نے کبھی یہ سوچنے کا تکلف تک نہیں کیا کہ تمھاری

جان بچانے کو میں نے اپنی جان داؤ پر کیوں لگا دی

تھی، تمھارا عشق میری رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے رانا لویزا میر ہادی اسی لیے تم مجھے اپنی انا سے بھی زیادہ عزیز ہو، تمھاری خاطر میں اپنی انا کو تمھارے قدموں کی خاک بنا سکتا ہوں، میں خود تمھارے لیے خاک ہو سکتا ہوں، تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تھیں تو میں جیسے پاگل ہو گیا تھا اسی لیے جب سے ملی ہو بس وہی غصہ تم پر نکال رہا تھا، میں تمھارے بغیر ایک پل بھی نہیں جی سکتا لویزا، تمھیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

وہ لفظ مسیحائی اس کی رگوں میں اتار رہا تھا۔ لویزا کو
سکون در سکون اپنے اندر اترتا محسوس ہوا تھا۔ وہ ساتھ
ساتھ اسے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا رہا تھا۔ وہ اس
کے آگے جھک گیا تھا۔ اپنی ہستی فراموش کر گیا تھا۔
اپنا آپ اسے کھول کر دکھا گیا تھا۔ لویزا آنسو بہاتی کھانا
کھالئے گئی۔ وہ اسے پیٹ بھر کر کھانا کھلا چکا تھا۔
تم مجھے چھوڑ کر کیوں گئیں تھیں لیزا؟" وہ اب شکوہ
لیے درد بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

مجھے طلاق دینے کی بات کیوں کہ تھی۔" وہ چیخ کر" کہتی اس کا گریبان جھنجھوڑ گئی۔

چلو میں تو تھا ہی الو کا پٹھا، تم تو سمجھداری سے کام" لیتیں۔" وہ سنجیدہ تھا مگر لہجے میں حسب معمول شرارت عود کر آئی۔

آئندہ اس بخت تخت کا نام میرے سامنے لیا تو آپ" کا سر پھاڑ دوں گی۔" وہ اب بھی پنجے جھاڑے ہوئے اس کو نوچ کھانے کو تیار تھی۔

ملکہ کا شوق سلامت سر اور بہت، اور کچھ۔" میر"

ہادی نے کہتے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سختی

سے اپنی جانب کھینچا تو وہ سٹپٹا گئی جو اتنی دیر سے

اس سے ہاتھا پائی کرنے پر آمادہ تھی۔

"اور کچھ نہیں، اب چھوڑیں اور مجھے میرا فون دیں۔"

وہ پھر سے اس کے ہاتھوں کی بے باکی پر تپ اٹھی۔

وہ تو اسی دن سے تمہاری طرف کے سائیڈ ڈرار میں پڑا"

تھا بے وقوف احمق لڑکی، مجھ سے توجہ ایک پل کے

لیے بھی ادھر ادھر کرتی تو نظر آتا ناں۔" وہ اب

شرارت بھرے لہجے میں اسے چھیڑ گیا تھا۔ لویزا پھر سے سلگ اٹھی۔

"ہاں آپ اتنے ہی شہزادے گلفام ہیں ناں جیسے۔" وہ اب پرسکون تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کا دوبدو مقابلا کر رہی تھی۔ میر ہادی گہرا مسکرایا۔

"خیر تمھارے لئے تو ہوں اگر نا ہوتا تو تم ایسے دل و جاں سے فدا تھوڑی ہوتی مجھ پر۔" میر ہادی کہتے دانتوں تلے لب دبایا۔ وہ جھنجھلا اٹھی۔

"آپ کبھی اس بات کی جان چھوڑیں گے یا نہیں۔"

وہ جھلا اٹھی۔

"یہ بات میرے جینے کی وجہ ہے لیزا ، اس کی جان کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔" میر ہادی نے نرمی سے کہتے اس کا سر اپنے سینے پر دل کے مقام پر رکھا اور سکون سے آنکھیں موند لیں۔ لویزا اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتی دل سے مسکرائی تھی۔

ختم شد--------